انقلاب زندہ باد
منورما دیوان

منورما دیوان

انقلاب زندہ باد

پریس ایشیا پبلیکیشنز

اس کتاب میں مکتبہ جامعہ کا املا استعمال کیا گیا۔

ناشر: پریس ایشیا انٹرنیشنل
۱۹ — A گل مہر پارک، نئی دہلی 110049

تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی - 110025
" " " اردو بازار، دہلی - 110006
" " " پرنس بلڈنگ، بمبئی - 400003
" " " شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ - 202001

کور ڈیزائن: اسٹوڈیو سی - ۴۰
۴۰ - ج ایسٹ آف کیلاش، نئی دہلی 110024

پہلی بار جنوری ۱۹۸۵ء 1,000

(نعمانی پرنٹنگ پریس دہلی ۶)

انتساب

اپنی ماں سورگیہ سیتا دیوی اور والد پرنسپل
چھبیل داس کے نام، جنھوں نے انقلاب
کے معنے سمجھائے اور 'انقلاب زندہ باد' کا
نعرہ لگانے کی ترغیب اور حوصلہ دیا۔

انقلاب زندہ باد کیوں؟

بچپن ہی سے مجھے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ سب سے اچھا لگتا تھا۔ شاید یہ وہ نعرہ تھا جسے میرے ننھے کانوں نے ہوش سنبھالتے ہی سب سے پہلے سنا تھا۔ چونکہ ہماری والدہ سیتا دیوی اور والد پرنسپل چھبیل داس دونوں ہی سرگرم سیاسی کارکن تھے اور ہم اس لاجپت رائے بھون میں رہتے تھے جو لاہور کی سیاسی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا، اس لیے ہمارے گھر میں ہمیشہ انقلاب ہی کی باتیں ہوتی تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ ہم بچوں کو "انقلاب زندہ باد" گھٹی میں ملا تھا۔

بات بھی یہ سچ تھی، جب ہوش سنبھالا تو اپنے والدین کو سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں سرگرمی سے حصہ لیتے یا ہنستے ہوئے جیل جاتے دیکھا۔ ہمارے والدین جیل جاتے اور ہم بچے رونے کے بجائے جوش میں آکر خوشی سے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگاتے۔ ہم نے ہمیشہ خود کو ملک کی جنگ آزادی کا ایک اہم حصہ سمجھا۔ ہم باتیں کرتے تو ملک کو آزاد کرانے کی، ہم ڈرامے کرتے تو جنگ آزادی کے۔ دسہرے کے دن ہم راون کے نہیں بلکہ برٹش سامراج کے پتلے جلاتے۔ عید ہو یا دیوالی ہم آزادی ہی کے ترانے گاتے تھے۔ موٹی کھادی کے کپڑے بہت فخر سے پہنتے۔ ہم ہر بدیسی مال سے نفرت کرتے "ٹوڈی" ہمارے لیے سب سے بڑی گالی تھی۔ کسی کو برا بھلا کہنا ہوتا تو اسے ٹوڈی کہتے تھے۔

ہمارے گھر میں ہمیشہ انقلاب اور انقلابیوں ہی کا چرچہ رہتا۔ عظیم انقلابی شہید بھگت سنگھ نیشنل کالج لاہور میں میرے والد ہی کے شاگرد تھے۔ ہمارے والد مشہور انقلابی لالہ لاجپت رائے کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اور لالہ جی کی بنائی ہوئی سرونٹس آف پیوپل سوسائٹی کے ممبر تھے، اسی لیے ہم لوگ لاجپت رائے بھون میں رہتے تھے۔

میرے والد پرنسپل چھبیل داس کے مشہور کتابچے "انقلاب زندہ باد" نے اس وقت کی نوجوان نسل کو متاثر کیا تھا۔ برسوں تک ڈھیروں لوگوں سے میں نے اسی کتابچے کا ذکر سنا۔

میری یہ کتاب "انقلاب زندہ باد" بھی اسی وقت سے چلے آرہے انقلابی جذبے کا ایک حصہ ہے۔

"انقلاب زندہ باد" محض میرے بچپن یا ہمارے خاندان کی کہانی نہیں ہے۔ یہ ان پانچ سالوں یعنی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کی جنگ آزادی کی کہانی ہے جس میں میری عمر کے بچوں نے ہاتھ بٹایا تھا۔ یہ مجھ جیسے بہت سے ان بچوں کی زندگی کی داستان ہے جن کے والدین نے جنگ آزادی میں اپنی قربانیاں دیں۔ یہ ان بچوں کی کہانی ہے جن کی زندگی کی ڈکشنری کا پہلا لفظ "انقلاب" تھا اور آخری لفظ "زندہ باد"۔

آج کے بدلے ہوئے حالات نے بھی جن میں بچپن کے تجزیئے آزادی کے سارے سپنے چکنا چور ہوگئے ہیں، مجھے "انقلاب زندہ باد" لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ ہم بچوں نے تو آزاد ہندوستان کا ایک سُنہرا خاکہ تیار کیا تھا۔ ہم نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ آزادی کے بعد بھی ہندوستان میں ایسی غریب بستیاں ہوں گی جہاں انسانوں کے بچے گندگی کے ڈھیروں سے جھوٹے نوالے ڈھونڈنے کے لیے جانوروں کے ساتھ چھینا جھپٹی کریں گے۔ ہمیں تو یہی یقین تھا کہ "آزاد ہندوستان" میں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا۔

ہو سکتا ہے "انقلاب زندہ باد" میں بہت سے ان لوگوں کا ذکر یا نام نہ آیا ہو جو اس وقت اُس "عظیم سیاسی خاندان" کے ممبر تھے جو جنگ آزادی میں سرگرمی سے اپنا حصہ بٹا رہا تھا۔ اس غلطی کی ساری ذمے داری میری یادداشت پر آتی ہے جو میری اس کتاب "انقلاب زندہ باد" کی بنیاد رہی ہے۔ میں اس سیاسی خاندان کے ہر ممبر کی احسان مند ہوں۔

مجھے خاص طور سے اپنے شوہر دیوان بیرندر ناتھ (ظفر پیامی) اور اپنی دونوں بیٹیوں صبا اور سیمیرا کا شکریہ ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنے بچپن کی یادوں کو کتاب کی شکل میں محفوظ کرلوں۔

منورما دیوان　　　　۲۶۔۱۔۱۹۸۵

فہرست

۸ر اگست ۱۹۴۲ء

لاجپت رائے بھون لاہور ۔۔ ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح۔

اس دن بے حد گرمی تھی۔ لاہور میں اگست کا مہینہ سخت گرمی کا ہوتا ہے۔ رات بھر کہیں بھی پتہ نہیں ہلتا، اسی لیے اس سے پہلی رات بھاری بے چینی میں بیتی تھی۔

ہمارے گھر کے لوگ کچھ زیادہ ہی پریشان تھے کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے ہماری ماں شریمتی سیتا دیوی (جو ۱۹۴۶ء میں لاہور سے پنجاب کی اسمبلی کی ممبر چنی گئیں اور تقسیم کے بعد پنجاب اسمبلی اور کونسل کی ممبر رہیں اور ۲۰ مارچ ۱۹۷۴ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو وہ راجیہ سبھا کی ممبر تھیں۔) کو تیز بخار آ رہا تھا۔ اس دن بھی انہیں تقریباً ۱۰۳ ڈگری بخار تھا۔ انہیں دیکھنے کے لیے ڈاکٹروں سے زیادہ سیاسی کارکنوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔

ویسے بھی لاہور میں لاجپت رائے بھون، عظیم انقلابی لالہ لاجپت

رائے کی بنائی گئی سرونٹ آف پیوپل سوسائٹی کا مرکزی دفتر بھی تھا اور پنجاب کی سیاسی کارروائیوں کا مرکز بھی - میرے والد پرنسپل چھبیل داس، لالہ لاجپت رائے کے قریبی لوگوں میں سے تھے - وہ سرونٹس آف پیوپل سوسائٹی کے ممبر تھے - جنگ آزادی کے دنوں میں لاہور میں جو نیشنل کالج بنایا گیا تھا، ہمارے والد اس کے پرنسپل تھے - لاجپت رائے بھون کو جنگ آزادی کے سپاہیوں کی ایک چھوٹی سی کالونی کا نام دینا شاید غلط بات نہ ہوگی -

۸ر اگست ۱۹۴۲ء کی صبح ہی سے لاجپت رائے بھون میں ایک خاص ہلچل دکھائی دے رہی تھی کیونکہ اس دن وہاں پر کانگریسی کارکنوں کی میٹنگ بلائی گئی تھی - بی بی جی پریشان تھیں کہ بخار کی حالت میں میٹنگ میں کیسے شامل ہوں گی - ادھر ڈاکٹر بی بی جی کی دوا کا نسخہ لکھتا اور انھیں مکمل آرام کی ہدایت دیتا اور ادھر سیاسی مسائل پر بحث شروع ہو جاتی تو گھنٹوں تک چلتی - ہماری دادی جنھیں ہم پیار سے "دے دے" کہتے تھے، پریشان ہو کر چلاتیں کہ آخر ہماری ماں کا بخار کیسے اترے گا جبکہ وہ بخار کی حالت میں گھنٹوں تک سیاسی بحث میں الجھی رہتی ہیں - اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید بیمار کو بھی اسی قسم کا علاج پسند تھا کہ سیاسی بحث کا سلسلہ چلتا رہے - ہماری دادی کو اس بات کی بھی شکایت تھی کہ بی بی جی کا حال چال پوچھنے دن میں ہر وقت لوگ چلے آتے تھے اور اس سے تقریباً سارا دن ہی روٹی پکانے کے لیے تنور گرم رکھنا پڑتا تھا -

ان دنوں جنگ آزادی میں جو جُھتے ہوئے سیاسی کارکنوں کا آپسی پیار ایسا تھا جیسے ایک بڑے خاندان کے سگے بھائی بہن ہوں۔ جو کوئی بھی آتا، کھانا ضرور کھاتا۔ لوگوں میں اتنا اپناپن تھا کہ اس بات کی پرواتک نہ ہوتی کہ کھانے کے وقت دال یا ترکاری ختم ہوگئی ہے۔ وہ لوگ اچار ہی سے کھانا کھاتے رہتے۔ ہماری دے دے اکثر ہنس کر کہتیں "کانگریسیوں کے گھروں میں تو اچار کے باغات لگانے چاہئیں۔ جب ضرورت پڑی توڑ لیا۔ مرتبانوں میں پڑے اچاروں سے ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔"

اس دن بھی صبح سویرے ہی سے ہمارے گھر میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ دہی کی لسی کے ڈھیروں گلاس تیار ہو رہے تھے۔ میں نیچے لاجپت رائے بھون کے باغیچے میں آئی تو مرحوم لالہ موہن لال جی کی بیٹی سدرشن دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی چلو چل کر دیکھیں۔ لاجپت رائے بھون کے چاروں طرف پولیس نے گھیرا ڈال دیا ہے اور ہر آنے جانے والے کا نام پتہ پوچھ رہے ہیں۔ لالہ موہن لال جی ہمارے پڑوسی تھے۔ وہ بھی سرونٹ آف پیوپل سوسائٹی کے ممبر تھے۔ ہم انھیں چچا کہتے تھے اور ان کے بچوں کے ساتھ ہمارا بہت پیار تھا۔ تقسیم کے بعد بھی انھوں نے جالندھر میں بہت محنت کے ساتھ ہریجنوں کی بہتری کا کام کیا اور جالندھر میں گلاب دیوی ٹی بی اسپتال بنوانے کے لیے محنت سے چندہ جمع کیا تھا۔

جب سدرشن نے مجھے پولیس کے گھیرے کی بات بتائی تو مجھے ذرا بھی تعجب نہیں ہوا کیونکہ پولیس کا آنا ہمارے لیے کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ پھر پچھلے بہت دنوں سے لاجپت رائے بھون میں سیاسی سرگرمی بڑھی ہوئی تھی۔ ۸ راگست کی میٹنگ کی تیاری ہو رہی تھی۔ رات دو بجے تک میٹنگیں ہوتی رہیں۔ سبھی کانگریسی کارکن ۸ راگست کی میٹنگ کا انتظار بھی کر رہے تھے اور اس کے لیے تیاری بھی۔

میری بڑی بہن سنتوش (ڈاکٹر سنتوش سود جو آج کل چنڈی گڑھ میں پنجاب یونیورسٹی میں پولیٹکل سائنس کے شعبے میں ہیں) اور میرا کام یہی تھا کہ ہم ان سیاسی میٹنگوں کے لیے نیچے سے اوپر تک کاغذ پہنچاتے رہیں۔ کیونکہ ہماری ماں بیمار تھیں اور ان کے تیز بخار کی وجہ سے بابو جی بھی ان کے پاس بیٹھے رہتے تھے، اس لیے پچھلے ایک ہفتے سے ہونے والی میٹنگوں میں ان کے ساتھ مشورہ تھوڑی دیر بعد بھیجے جانے والی چٹھیوں کے ذریعے ہی ہوتا تھا۔ ہم بچے بہت خوشی سے یہ کام کرتے۔ شاید اس وقت ہمیں اس بات کا احساس تھا کہ ہم یہ کام کر کے جنگ آزادی میں اپنا حصہ دے رہے ہیں۔

کارکنوں کی لسٹیں بنتیں۔ مجھے اور سنتوش کو لاہور کے سارے کانگریسی کارکنوں کے نام زبانی یاد تھے ایک دو بار تو میں نے اور سنتوش نے بی جی کو یاد دلایا کہ شہر کے اندر ڈبی بازار میں رہنے والی دو خواتین کانگریسی ورکروں کا نام ۸ راگست کی میٹنگ میں شامل ہی نہیں ہوا۔

ہم لاجپت رائے بھون کے بچے ہر وقت یہی باتیں کرتے کہ ۸ ر اگست کا دن کتنا اہم ہے کیونکہ گاندھی جی نے اس دن کے لیے یہ نعرہ دیا تھا "انگریزو بھارت چھوڑو" ساتھ ہی "کرو یا مرو" کا نعرہ بھی دیا گیا تھا۔ ہم ۸ ر اگست کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔ ہمارے گھر میں بھی دروازے بند کر کے دن رات میٹنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اکثر کارکن بی بی جی سے اکثر یہی کہتے کہ آپ کو بھی اسی دن بیمار ہونا تھا؟ جیسے وہ دن کسی بڑے جشن کا ہو۔ سچ مچ وہ دن بہت بڑے جشن کا تھا، جس کا ہم بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

میں اور سدرشن پولیس والوں کے پاس پہنچ گئے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ پولیس والے ہمارے گھر کو گھیر لیں اور ہم ان کا مذاق اڑائیں۔ پولیس سے ہمیں ذرا بھی خوف نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ہمیں تو ان پر ترس آتا تھا کیونکہ ہماری والدہ نے ہمیں یہی بتایا تھا کہ یہ بیچارے پیٹ کی خاطر انگریزوں کی نوکری کرتے اور کانگریسیوں کو گرفتار کرتے ہیں۔ اس لیے میں جب کسی پولیس والے کو دیکھتی تو اس سے یہی سوال پوچھتی کہ وہ انگریز کی نوکری کیوں کرتا ہے۔ کیا اسے اپنے وطن کی آزادی پیاری نہیں؟

اس دن یعنی ۸ ر اگست ۱۹۴۲ء کو بھی میں آگے بڑھ کر ایک سپاہی سے اسی طرح کا سوال پوچھنے ہی والی تھی کہ ٹھیک اسی وقت

لال لال چہرے والا ایک انگریز افسر جیپ سے اترا اور ہاتھ میں ہنٹر گھماتے ہوئے سپاہیوں کو کچھ فاصلے پر کھڑے ہونے کا حکم دینے لگا۔ میں نے اور سدرشن نے اپنی عادت کے مطابق آزادی کے گانے گا کر اس انگریز افسر کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر مجھ سے میرا اور میرے والد کا نام پوچھا۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بے دھڑک اپنا نام بتا دیا۔ پھر بہت اونچی آواز میں میں نے سدرشن سے کہا، چلو یہاں سے چلیں۔ ان انگریزوں کے پاس رکنا بھی ہمیں اچھا نہیں لگتا۔

میں بھاگی بھاگی گھر آئی اور آکر بی جی اور بابو جی کو بتایا کہ بہت سی پولیس لاجپت رائے بھون کو گھیرے ہوئے ہے۔ میں نے بہت فخر سے انگریز افسر سے ہوئی اپنی بات چیت کو بھی دہرایا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں پولیس کا آنا کوئی عجوبہ نہیں تھا، اس لیے میری بات پر کسی نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ بابو جی نے تو غصے سے کہا بھی "پولیس آتی ہے تو آنے دو۔ ہم کیا کریں؟" آج جب کہ پولیس سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، پھر بھی اگر پولیس کا کوئی سپاہی کسی کے گھر پہنچ جائے تو وہاں پریشانی کا عالم طاری ہو جاتا ہے، لیکن ہم لاجپت رائے بھون کے لوگوں کے لیے پولیس کے ڈھیروں سپاہیوں کا آنا اور گھر کو گھیر لینا کوئی بڑی خبر نہ تھی۔

بڑی بات چاہے ہو یا نہ ہو، ہم بچوں کو اُدھم مچانے کا اچھا موقع

مل گیا۔ پولیس والوں کا مذاق اڑانے اور انھیں پریشان کرنے کو ہم اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں نے اور سنتوش نے فوراً لاجپت رائے بھون کے بچوں کو جمع کر کے چھوٹے چھوٹے ٹھیکرے پولیس پر پھینکنے کی اسکیم بنائی۔ پولیس والوں کو مارنے کے لیے ہم نے کچی کھجوروں پر گیلی مٹی چڑھا کر ڈھیروں ٹھیکرے تیار کر رکھے تھے۔

ہماری اسکیم تیار ہو ہی رہی تھی کہ ہم پولیس کا مقابلہ کیسے کریں، تب تک پولیس لاجپت رائے بھون کے پھاٹک تک پہنچ چکی تھی۔ انگریز پولیس افسر مسٹر ٹیلر لاجپت رائے بھون کے بڑے پھاٹک پر ایک بڑی سی لسٹ لیے کھڑا تھا۔ جو شخص وہاں آتا اس کا نام پوچھتا اور اگر اس کا نام لسٹ میں موجود ہوتا تو اسے ایک طرف الگ کھڑا کر دیا جاتا۔ آنے والے اکثر لوگوں کے نام اس لسٹ میں موجود تھے۔

ہمیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ اس وقت ساڑھے نو بج چکے تھے۔ کیونکہ کانگریس کارکنوں کی میٹنگ کا وقت دس بجے رکھا گیا تھا، اس لیے میٹنگ کے لیے بہت سے لوگ آ چکے تھے اور گرفتار بھی کیے جا چکے تھے۔

اسی وقت سدرشن کا بھائی اندر، جھولی بھر کر مٹی کی وہ گولیاں لے آیا جو ہم نے پولیس والوں کو مارنے کے لیے تیار کر رکھی تھیں۔ اندر نے میرے کان میں کہا کہ وہ اونچی دیوار پر چڑھ کر نشانہ لگائے گا اور وہاں سے وہ پولیس کی پیٹھ پر گولیاں پھینکے گا۔ اس وقت ہم بچوں کو

یہ احساس ہوگیا تھا کہ موقع بہت نازک ہے اور پولیس کو پتھر یا ڈھیلے مارنے کا وقت نہیں ہے۔ ہم نے اندر کو پولیس والوں پر ڈھیلے پھینکنے سے منع کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اندر نے غصے کے مارے وہ ساری مٹی کی گولیاں پانی کے نیچے پٹک کر دھو ڈالیں کوئی اور موقع ہوتا تو اسی بات پر اندر کی اچھی پٹائی ہو جاتی، لیکن وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہم میں سے کسی نے بھی اندر کو کچھ نہیں کہا۔

اس دن گرفتاریاں بہت دلچسپ ڈھنگ سے ہو رہی تھیں۔ چچا موہن لال کا پیٹ پچھلے کچھ دن سے خراب تھا۔ وہ لوٹا اٹھائے باہر جا رہے تھے کہ پولیس افسر نے روک کر ان کا نام پوچھا۔ ظاہر ہے کہ لسٹ میں ان کا نام تھا۔ انھیں بھی ایک طرف حراست میں لیے لوگوں کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ بیچارے پیٹ تھامے کھڑے تھے ان کے باقی ساتھی خوب ہنس رہے تھے کہ وہ کیسی اچھی پکڑ میں آئے ہیں۔

ایک دوسرے مشہور کانگریسی کارکن اودم پرکاش ترکھا جو اکثر شاہدرا میں بنے گاندھی آشرم میں کام کرتے تھے، رات ہی کو واپس لوٹے تھے۔ ان کی بیوی لکشمی دیوی نے انھیں کھچڑی کے ساتھ کھانے کے لیے دہی لینے نیچے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ جب تک تھالیوں میں کھچڑی پروستی ہیں وہ دہی لے کر آجائیں۔ دہی سے بھرا ہوا کٹورا ان کے ہاتھ میں تھا۔ تبھی انگریز افسر نے ان کا نام پوچھا اور انھیں گرفتار کر لیا۔ تب اودم پرکاش ترکھا جی نے پاس میں کھڑے کسی بچے کے ہاتھ میں دہی

سے گھبرا بر تن تھماتے ہوئے کہا "جاؤ اوپر جاکر اپنی چچی کو دہی دے آؤ اور کہہ دینا کہ میں جیل جا رہا ہوں۔"

جب بچے نے اوپر جاکر چچی کو بتایا تو لکشمی دیوی جی نے یہی سمجھا کہ ان کے شوہر ہمیشہ کی طرح مذاق کر رہے ہیں۔ انھوں نے چھت سے جھانک کر دیکھا اور ادم پرکاش جی سے کہا "آپ بھی عجب انسان ہیں۔ کھچڑی ٹھنڈی ہو گئی ہے اور آپ کو جیل جانے کے مذاق کی سوجھی ہے۔" لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ بات محض میاں بیوی کے مذاق کی نہیں، بلکہ جیل جانے کی ہے تو وہ بھی جلدی سے نیچے اتر آئیں۔ دونوں تھالیوں میں پروسی کھچڑی اسی طرح پڑی رہی۔ بعد میں کئی سالوں تک ہم بچے چچا ادم پرکاش ترکھا اور چچی لکشمی کو ان کی کھچڑی کا قصہ سنا کر مذاق کیا کرتے تھے۔ لاجپت رائے بھون میں جب کسی کے گھر کھچڑی پکتی تو ادم پرکاش ترکھا جی کے جیل جانے کا قصہ ضرور سننے میں آتا۔

ہم سبھی بچے پولیس والوں کے قریب کھڑے ہو کر بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کہ وہ گرفتاریاں کس طرح کر رہے ہیں جب بھی ہم انگریز پولیس افسر کا لال منہ دیکھتے تو زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتے۔

"شیٹا ڈیوی" کی تلاش

مجھے اور میری بہن سنتوش کو اپنی بہت اہمیت محسوس ہوئی جب انگریز پولیس افسر نے ہر آنے جانے والی عورت سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ کیا اس کا نام شیٹا ڈیوی ہے؟ (سیتا دیوی ہیم ہماری ماں کی تلاش زور زور سے ہو رہی تھی۔ جب عورتیں جواب دیتیں کہ وہ سیتا دیوی نہیں ہیں تو پولیس کے پاس ہی ایک گھیرے میں کھڑے گرفتار لوگ زور زور سے قہقہہ لگاتے۔ اس پر وہ انگریز افسر تلملا کر رہ جاتا اور ہم بچے بہت خوش ہوتے۔ آج لمبے عرصے کے بعد اس منظر کے متعلق سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ وہ کتنا انوکھا احساس تھا کہ پولیس ہماری ماں کو گرفتار کرنا چاہتی تھی اور ہم بچوں کو اس کا ذرا سا بھی غم نہ تھا۔ سنتوش اور میں اسی بات کو لے کر خوش ہو رہے تھے کہ یہ افسر پریشان ہو رہا ہے اور اسے "شیٹا ڈیوی" نہیں مل رہی ہے۔

تھوڑی دیر بعد کسی نے انگریز افسر سے کہا کہ سیتا دیوی تو سامنے والے گھر میں رہتی ہیں۔ یہ سنتے ہی کرشن کانت جنہیں ہم سب بچے بھاپا جی کہتے تھے بھاگے بھاگے ہمارے گھر کی سیڑھیاں چڑھ گئے، ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ کرشن کانت اہم نوجوان اور ترقی پسند سمجھے جانے والے ممبر پارلیمنٹ رہے ہیں۔ ان کی گنتی کانگریس پارٹی کے ینگ ٹرک یعنی نوجوان ترک میں ہوا کرتی تھی جب کانگریس کے دو حصے ہوئے تو وہ آزاد ممبر کے طور پر رہے اور آج کل جنتا پارٹی کے اہم لیڈروں میں سے ایک ہیں۔ کرشن کانت، مرحوم لالہ اچنت رام جی کے بیٹے ہیں جو مشہور کانگریسی لیڈر اور سرونٹس آف پیوپل سوسائٹی کے ممبر تھے۔ اچنت رام جی آچاریہ ونوبا بھاوے کے ساتھ بھی ان کی بھودان تحریک میں کام کرتے رہے۔ لالہ اچنت رام جی بھی ہمارے پڑوسی تھے اور ہم انھیں چچا کہتے تھے۔ ان کی اہلیہ سیتا وتی ہم لوگوں کو بہت پیار کرتی تھیں اور ان کے تین بچے کرشن کانت، سوبھدرا اور نرمل ہمارے اپنے بھائی بہنوں جیسے تھے۔

جونہی کرشن کانت جی نے ہمارے گھر آکر کہا کہ چچی آپ کے وارنٹ ہیں اور آپ کو گرفتاری کے لیے نیچے بلا رہے ہیں تو ہمارے بابوجی بول اٹھے "جنھیں گرفتار کرنا ہے اوپر آجائیں۔

ہم کسی کے نوکر نہیں کہ جا کر خدمت میں حاضر ہوں ۔"

بھاپا کرشن کانت نیچے چلے گئے اور ہم نے دیکھا کہ گرفتاری کی بات سن کر نہ تو بی جی اور نہ ہی باؤجی کو کسی قسم کی پریشانی کا احساس ہوا ۔ ڈاکٹر رشی جو پچھلے کچھ دنوں سے بی بی جی کا علاج کر رہے تھے اور اس وقت بھی پاس بیٹھے ہوئے تھے، ہنس کر کہنے لگے "بہن جی آپ کی بیماری کا تو اب علاج ہو گیا ۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔" یہ سن کر بی جی اور باؤجی ہنسنے لگے ۔ ہم بچوں کو اس بات سے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد ہماری ماں ہمیں چھوڑ کر جیل چلی جائیں گی اور پھر جیل جانے کا مطلب صاف تھا کہ نہ جانے وہاں کتنے لگ جائیں گے ۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی ہم بچے بے چینی سے پولیس کا انتظار کر رہے تھے ۔ ہم اپنی ماں کو گرفتار ہوتے دیکھنا چاہتے تھے ۔

ہم نے بڑی کھڑکی میں سے جھانکنا شروع کر دیا کہ دیکھیں پولیس والے آ بھی رہے ہیں یا نہیں ۔ سچ جانیے کہ اس وقت پولیس کے آنے میں جتنی دیر ہو رہی تھی، ہم بچوں کی پریشانی اتنی ہی بڑھ رہی تھی ۔ سنتوش مجھے بار بار یہی کہتے کہ میں نیچے جا کر دیکھوں کہ پولیس والے آنے میں دیر کیوں کر رہے ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد ہمارے گھر کی سیڑھیوں پر دھڑ دھڑاتے ہوئے انگریز افسر، سی ۔ آئی ۔ ڈی انسپکٹر اور ڈھیروں پولیس والے آ گئے ۔ ان کے ساتھ

لاجپت رائے بھون کے بھی کچھ لوگ تھے۔ کرشن کانت سب سے آگے تھے۔ بی بی جی اندر کے بڑے کمرے میں لیٹی تھیں کیونکہ وہی ہمارے گھر کا سب سے ٹھنڈا کمرہ تھا۔

پولیس آئی تو بی بی جی اور بابو جی نے ان کی طرف ایسے دیکھا جیسے انھوں نے آکر ان کی کسی دلچسپ گفتگو میں خلل ڈالا ہو۔ بابو جی نے ذرا غصے کے لہجے میں پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہم سبھی اچھی طرح جانتے تھے کہ پولیس ہماری بی بی جی کو گرفتار کرنے آئی ہے، کیونکہ پچھلے ایک گھنٹے سے انگریز پولیس افسر انھیں کے نام کی دہائی دے رہا تھا۔

پولیس افسر نے وارنٹ دکھاتے ہوئے کہا "سیتا دیوی کے نام گرفتاری کا وارنٹ ہے۔" یہ سنتے ہی بی بی جی بستر سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کہنے لگیں کہ "میرا نام ہی سیتا دیوی ہے، چلیے۔" بی بی جی اس تیزی سے اٹھیں جیسے وہ جانے کے لیے تیار ہی بیٹھی تھیں۔ اس وقت کسی کو بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ بیمار تھیں اور انھیں ایک سو تین پوائنٹ چھ ڈگری بخار تھا۔ انھوں نے اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں اپنے کپڑوں کی الماری کھولی اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے کپڑے نکال لیے۔

یہ سب دیکھ کر ڈاکٹر رشی نے کہا "سیتا دیوی بیمار ہے، اسے تیز بخار ہے، وہ کیسے جا سکتی ہے؟" انگریز افسر نے فوراً جواب دیا کہ ہم ان کو ایمبولنس میں لے جائے گا۔" یہ سن کر بی بی جی نے بہت روکھی

آواز میں کہا "تھینکس، مجھے آپ کی ایمبولنس نہیں چاہیے۔ میں اسی طرح چلوں گی۔" ہم بچوں کو یہ سارا نظارہ ایک دلچسپ ڈرامے کی طرح لگ رہا تھا اور اس وقت یہ احساس نہ تھا کہ ہماری ماں ہمیں چھوڑ کر جیل جا رہی ہے۔

بی بی جی نے چابیوں کا بڑا سا گچھا بابو جی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا "آپ گھر اور بچوں کو سنبھالیے"

ایسا کہتے ہوئے وہ خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔ اُن کے چہرے پر خوف یا پریشانی کی کوئی شکن نہیں تھی، حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ انھیں برسوں تک جیل میں رہنا ہوگا۔ اس وقت ہماری بی بی جی کی عمر ۳۲ برس کی رہی ہوگی اور وہ جیل جانے کے لیے اس طرح بے صبری دکھا رہی تھیں کہ جیسے کوئی عورت برسوں بعد اپنے میکے جا رہی ہو۔

اس وقت ہمارے گھر میں پندرہ کے قریب پولیس کے لوگ ہوں گے۔ وہ اسی بڑے کمرے میں کھڑے تھے، جہاں پہلے بی بی جی لیٹی ہوئی تھیں، اور ساتھ کے کمرے میں بی بی جی بہت سی ہدایتیں ایک ساتھ بابو جی کو دے رہی تھیں۔ مجھے ان دنوں کافی کھانسی تھی۔ کیونکہ اسکول میں چھٹیاں تھیں اور ہم سب بچے املی اور آم چور میں چینی ملا کر چورن کھاتے تھے۔ بی بی جی نے میرے متعلق خاص طور سے بابو جی سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کو دکھائیں اور چورن نہ کھانے دیں۔ بابو جی ہنستے ہوئے سب ہدایتیں سُن رہے تھے۔

تمام ہدایتیں سُننے کے بعد جب چابیوں کا گچھا ہاتھ میں لیے بابوجی، بی بی جی کے ساتھ باہر کے کمرے میں آئے تو انگریز افسر نے ان کا بھی نام پوچھا، اور جب انھوں نے کہا مہ جھیبل داس" تو وہ لسٹ دیکھتے ہوئے بولا "آپ کے نام بھی وارنٹ ہیں۔ آپ بھی چلیے۔"
میں آج تک وہ مسکراہٹ نہیں بھول پائی ہوں جو اس وقت ایک ساتھ ہمیں اپنے والدین کے چہرے پر دیکھنے کو ملی۔ ہمارے بابوجی کھلکھلا کر ہنس پڑے اور بی بی جی نے ان کی طرف ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ اگر میں جیل جاؤں گی تو کیا تم پیچھے رہ سکتے ہو۔

اب دوسری الماری کا تالا کھلا۔ بابوجی کے کپڑے بھی نکالے گئے۔ بی بی جی نے ہماری بڑی بہن رِجے سے کہا کہ ان دونوں کے لیے بستر بھی لے آئیں۔ ہمارے بابوجی کو ہمیشہ ہی کہیں باہر جاتے ہوئے زیادہ کپڑے اٹھانے میں کوفت ہوتی تھی اور اکثر بابوجی کی اس عادت کو لے کر دونوں میاں بیوی میں بحث بھی ہو جاتی تھی۔ اس دن بھی بی بی جی نے بابوجی کے کپڑے نکالے تو انھوں نے عادت کے مطابق غصے سے یہی کہا کہ " اتنے کپڑے میں کیا کروں گا۔ انھیں کم کرو۔"

یہ سُن کر بی بی جی نے ہنس کر کہا تھا " کچھ اندازہ بھی ہے کہ ہم لوگ کتنے برسوں کے لیے جیل جا رہے ہیں؟" یہ سن کر ہمارے بابوجی اپنی عادت کے مطابق مسکرانے لگے۔ ان کے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی دیکھنے کو نہیں ملی۔ انھیں پریشانی تھی تو اس بات کی کہ کیا وہ اپنے ساتھ جیل

میں کچھ کتابیں لے جا سکتے ہیں یا نہیں، جب انھوں نے کتابوں کے متعلق انگریز افسر سے پوچھا تو اس نے یہی کہا کہ آپ اپنے ساتھ محض پہننے کے کپڑے اور دیگر ضرورت کا سامان ساتھ لے جا سکتے ہیں۔ پولیس کی موجودگی ہی میں بی بی جی اور بابو جی نے اپنا سامان باندھا۔ پندرہ بیس منٹ میں وہ تیار ہو گئے۔ شاید اس لیے کہ انھیں اس طرح جلدی تیار ہونے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ اسی سارے ہنگامے میں کسی کو ہمارے چھوٹے بھائی، اشوک کا خیال نہیں آیا۔ اشوک ان بچوں میں سے تھا جسے ایک جگہ کتابیں یا کھلونے دے کر بٹھا دیا جائے تو کہیں ہلنے کا نام نہ لے۔ اس وقت بھی وہ کوئی موٹی سی کتاب ہاتھ میں لیے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ وہ پولیس اور گرفتاری کے ہنگامے سے بالکل بے پروا تھا۔ اچانک بی بی جی کی نظر اس پر پڑی اور انھوں نے اس سے کہا کہ میں جیل جا رہی ہوں۔ یہ سن کر وہ ہنسا اور کہنے لگا کہ جائیے۔ آج حال یہ ہے کہ بچے جب ان کی ماں پڑوس میں بھی کسی سے ملنے جاتی ہے تو ساتھ جانے کے لیے ضد کرتے ہیں۔ لیکن ننھے اشوک نے انھیں اتنا ہی کہا۔
"جیل جاؤ میں گھر میں ہی کھیلوں گا۔"

ہمیں ان دنوں اپنے ماں باپ کا کسی جلسے یا جلوس میں جانا یا گرفتار ہو کر جیل جانا کوئی عجوبہ نہیں لگتا تھا۔ ہماری خالہ اور پھوپھی کے بچے اکثر حیرانی سے مجھ سے پوچھتے بھی۔ "کیا جب تمہارے ماں باپ جیل جاتے ہیں تو تمہیں رونا نہیں آتا؟" ہم ہمیشہ یہی کہا کرتے کہ اگر وہ جیل

نہیں جائیں گے تو ہندوستان آزاد کیسے ہوگا۔ اس وقت ہم بچوں کو یہ یقین تھا کہ جتنی بڑی تعداد میں انگریزوں کی جیلیں بھری جائیں گی اتنی ہی جلدی انگریز بھارت چھوڑ دیں گے۔ جیل کا راستہ ہی ہمیں آزادی کا راستہ دکھائی دیتا تھا۔

اشوک اٹھ کر بی بی جی کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ "ہمارے گھر اتنے ٹوڈی کیوں آئے ہیں؟" اشوک کی بات سن کر سبھی لوگ ہنسنے لگے اور اسے احساس ہوا کہ وہ بہت اہم شخصیت ہے کیونکہ اس نے کوئی ایسی بڑی بات کہی ہے جس پر سبھی لوگ ہنس رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ خود بھی زوروں سے ہنسنے لگا۔

بی بی جی نے ہماری سب سے بڑی بہن وجے سے کہا کہ وہ اشوک کا اچھی طرح سے خیال رکھے۔ وجے کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ انھوں نے بھی اس طرح سے حامی بھری جیسے کہ کوئی بہت بڑی لڑکی ہوں۔ کہنے لگی "آپ دونوں آرام سے جیل جاؤ گھر کی کوئی فکر نہ کرنا۔"

چونکہ اس دن ہماری پھوپھی کا چھوٹا لڑکا بہت بیمار تھا، اس لیے ہماری دادی اسے دیکھنے کے لیے پھوپھی کے گھر سنت نگر چلی گئی تھیں۔ گرفتاریوں کا سلسلہ دوپہر تک چلتا رہا۔

بی بی جی اور بابو جی اپنا سامان اٹھوا کر نیچے اتر گئے جہاں دوسرے بہت سے کانگریسی کارکن پہلے ہی پولیس کی حراست میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں بھی جا کر پولیس کے گھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ سبھی کانگریسی

کارکن ایک دوسرے کے ساتھ مذاق کر رہے تھے۔ مجھے کسی بھی چہرے پر کوئی پریشانی نظر نہیں آئی۔

ایک گھنٹہ اسی طرح بیت گیا۔ گرفتاریاں ہوتی رہیں۔ انگریز افسر بار بار اپنی لسٹ دیکھتا اور گرفتار ہوئے لوگوں کا گھیرا بڑھتا ہی جاتا۔ ہم نے دیکھا کہ پھاٹک کے باہر ان تمام حراست میں لیے لوگوں کو جیل لے جانے کے لیے بہت سی بند لاریاں آکر کھڑی ہو گئی ہیں۔ اس قسم کی لاری مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ میں اس کے اندر بیٹھ کر چھوٹے چھوٹے چھیدوں میں سے باہر کا نظارہ دیکھنا چاہتی تھی۔ لاجپت رائے بھون کے سبھی بچے ان لاریوں کے آس پاس جمع ہو گئے۔ میں اچک کر ایک لاری میں بیٹھ گئی اس پر نرمل نے مجھ سے کہا۔ "تم بھی جیل چلی جاؤ" میں نے ہنستے ہوئے کہا تھا "ابھی نہیں، جب میں بڑی ہو جاؤں گی تو اسی لاری میں بیٹھ کر جاؤں گی" تب نرمل نے ہنس کر کہا تھا "تب تم جیل کیوں جاؤں گی تب تک تو ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔" ہماری گفتگو سن کر لاریوں کے آس پاس کھڑے پولیس کے لوگ ہنسنے لگے۔

تبھی ایک انسپکٹر آیا۔ اس نے ہم سب بچوں کو وہاں سے بھاگنے کے لیے کہا، ہم ذرا دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اب ایک ایک کر کے گرفتار ہوئے لوگوں کو ان لاریوں میں بٹھلایا جانے لگا۔ عورتوں کو الگ لاریوں میں بٹھایا جا رہا تھا، کیونکہ انھیں الگ جیل میں رکھا جانا تھا۔ جب ہماری بی بی جی اور بابو جی اپنی اپنی لاری میں بیٹھنے

لگے تو سنتوش، اور میں نے مل کر زور سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ پھر سبھی لاریوں میں سے انقلاب زندہ باد کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ اس وقت پولیس والوں میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آزادی کے ان دیوانوں کو نعرے لگانے سے منع کریں۔

آہستہ آہستہ لاریوں کے دروازے بند ہو گئے، لیکن "انقلاب زندہ باد" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نعروں کی آوازیں برابر آتی رہیں۔ یہ تمام لاریاں ایک قافلے کی صورت میں چل پڑیں اور جب تک وہ ہماری نظروں سے دور نہ ہو گئیں ہم بچے گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے ہی رہے۔

اس کے بعد لاجپت رائے بھون کی حالت اس گھر جیسی نظر آ رہی تھی، جہاں پر دھوم دھام سے کوئی شادی ہوئی ہو اور دلہن بارات سمیت بدا ہو چکی ہو۔ سارے ماحول میں ایک خاموشی تھی، لیکن اسے اداسی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

کچھ لوگوں نے ہمارے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کی کوشش کی، کیونکہ لاجپت رائے بھون میں ہمارا ہی ایک گھر تھا جہاں ماں باپ دونوں ہی جیل چلے گئے تھے۔ ہمیں اس ہمدردی پر بہت غصہ آیا اور ایسی حماقت کرنے والوں کو ہم نے بُری طرح سے جھڑک دیا۔ ہم چاروں بھائی بہن بہت خوش تھے۔ ہمیں احساس تھا اور یقین بھی کہ ہمارے والدین ایک عظیم کام کے لیے جیل گئے ہیں ہم اس پر بہت فخر محسوس کر رہے تھے۔ ہماری بڑی بہن دیدی کو بیسن کے لڈو بہت پسند تھے۔ اس لیے ہم سب

نے مل کر بیسن کے لڈو بنائے۔ ہم تینوں بہنیں خوش تھیں، لیکن ہمیں ڈر تھا کہ کہیں اشوک شام ہوتے ہی بی بی جی کو پوچھنا نہ شروع کر دے۔ لیکن اشوک ہر روز کی طرح کھیل میں مست تھا۔ جب ہم نے اس سے کہا کہ بی بی جی جیل گئی ہیں، جلدی واپس آجائیں گی تو وہ ہنسنے لگا۔

کچھ دیر بعد میں اور سنتوش اپنی دادی کو لینے کے لیے اپنی پھوپھی سرسوتی کے گھر سنت نگر گئے۔ بی بی جی جیل جاتے وقت کہہ گئی تھیں کہ ہم فوراً جا کر انھیں لے آئیں۔ بی بی جی نے ہم سے یہ بھی کہا تھا کہ ہم تار بھیج کر ہردوار سے اپنی نانی جی کو بھی بلا لیں۔ ہماری نانی جی کا نام، جنھیں ہم ماتاجی کہتے تھے، ودیادھری تھا۔ وہ ہردوار کے پاس بنے گروکل کانگڑی میں رہا کرتی تھیں۔ ہمارے نانا اچاریہ رام دیو جی کو آریہ سماج کے بنانے والے لوگوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اس گروکل کو بنانے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ گروکل کانگڑی میں پہلی جماعت سے لے کر بی۔ اے تک کی پڑھائی ہوتی تھی۔ یہ محض لڑکوں کے لیے یونیورسٹی تھی، جہاں لڑکوں کے رہنے کے لیے ہاسٹل بھی تھے۔ اسی گروکل کانگڑی میں ہماری نانی رہا کرتی تھیں نانا کے انتقال کے بعد وہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت وہیں گزارنا چاہتی تھیں۔

راستے بھر سنتوش اور میں یہی پروگرام بناتے رہے کہ اپنی پھوپھی کے گھر جا کر انھیں کس ڈرامائی انداز میں بی بی جی اور بابوجی کے جیل جانے کی خبر سنائیں گے۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی سنتوش نے سارا مزا کرکرا کر دیا۔ جاتے ہی ایک دم سے کہنے لگی "دے دے گھر چلو۔ بی بی جی اور بابوجی دونوں

جیل چلے گئے ہیں" یہ سن کر وہاں سب لوگ ہنسنے لگے۔ ہماری پھوپھی سرسوتی ہنستے ہوئے بولیں " جیل کا مذاق چھوڑو، یہ بتاؤ کہ بھابی کا حال کیا ہے۔ ان کا بخار کم ہوا یا نہیں؟" ہماری پھوپھی پریشان تھیں۔ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے وہ بی بی جی کو دیکھنے نہ آسکی تھیں۔

اپنی پھوپھی کی بات سن کر میں اور سنتوش زور زور سے ہنسنے لگے۔ سنتوش کہنے لگی " اب ان کا بخار تو جیل میں ہی دیکھا جا رہا ہوگا۔" اب ہماری "دے دے" کو یقین ہو چکا تھا کہ بی جی اور بابو جی کے جیل جانے کی بات سچ ہے۔ اس نے ہماری پھوپھی کو کہا " چھبیل داس اور سیتا دیوی کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں۔ وہ کسی وقت بھی جیل جا سکتے ہیں۔" پھر ہم نے اپنی پھوپھی، پھوپھا اور ان کے بچوں کو پوری داستان سنائی کہ کس طرح لالہ لاجپت رائے بھون کو پولیس نے گھیرا اور کس طرح انگریز پولیس افسر "شیتا ڈیوی" کی تلاش کرتا رہا اور کس طرح بی بی جی کے بعد بابو جی کو بھی گرفتار کیا گیا اور کس طرح ان دونوں نے اپنا اپنا سامان باندھا۔ یہ سن کر ہماری پھوپھی رونے لگیں۔ ہماری دے دے ہمارے ساتھ گھر آنے کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ راستے بھر وہ ہم سے یہی کہتی رہیں " نہ جانے یہ انگریز کب ہندوستان سے جائیں گے اور کب ان کانگریسیوں کا جیل جانے کا سلسلہ بند ہوگا۔" ہماری دے دے کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے لیکن ہم انھیں ہنسانے کے لیے بتا رہے

تھے کہ آج ہم نے کتنے ڈھیر سے بیسن کے لڈو بنائے۔ یہ سُن کر ڈے ڈے کہنے لگیں کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بچے کیسے ہو۔ دونوں ماں باپ جیل گئے ہیں اور تم لڈّو بنا کر کھا رہے ہو۔

ننّھی قیدی

بی بی جی اور بابو جی کے جیل جانے کے کچھ دن بعد ہماری نانی بھی ہمارے پاس آگئیں۔ انھیں اپنی بیٹی اور داماد، دونوں کے جیل جانے کی اطلاع ایک ہفتہ بعد ملی تھی کیونکہ ان دنوں جنگ آزادی میں انقلابیوں نے جگہ جگہ ریل کی پٹریاں اکھاڑ پھینکی تھیں اور تاریں کاٹ ڈالی تھیں۔

لیکن ہمیں اس بات کا ذرا سا بھی غم نہ تھا کہ ہماری نانی دس دن تک نہیں آئیں۔ لاجپت رائے بھون میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ ان دنوں وہاں پر رہنے والے لوگوں کے آپسی رشتے ایسے تھے کہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ آج اگر ہمارے گھر میں کھانا نہیں پکا تو ہم کہاں کھائیں گے۔ جس دن سے بی بی جی اور بابو جی جیل گئے تھے، ہم سبھی بچے کھانا بھی تیہ وتی کے گھر میں کھایا کرتے تھے جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا کہ تیہ وتی جی لالہ اچنت رام کی بیوی اور کرشن کانت کی ماں تھیں انھوں نے ہمیں کبھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ محض ہمارے پڑوسی ہیں، بلکہ ہمیں یہی خیال ہوتا کہ وہ ہمارے سگے رشتے دار ہیں۔ ہماری نانی ہم سے بہت پیار کرتی تھیں۔ ہماری ہر ضد کو اس لیے

پورا کرتیں کہ کہیں ہم چھوٹے چھوٹے بچے اپنے والدین کو یاد کرکے پریشان نہ ہوں۔ یہ کہنا تو غلط ہوگا کہ ہم اپنی بی بی جی اور بابو جی کو یاد نہیں کرتے تھے، لیکن دوسروں کے سامنے یہ تسلیم کرنا ہم اپنی ہیٹی سمجھتے تھے۔

اگر کوئی ہماری نانی سے کہتا کہ بچے بیچارے اکیلے رہ گئے ہیں، ان کے ماں باپ دونوں ہی جیل میں چلے گئے، تو وہ رونے لگتیں۔ لیکن ہم تھے کہ ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے کہ اس نے ایسا کہنے کی ہمّت کیوں کی۔ مجھے یاد ہے کہ میں ایک بار اپنی سہیلی ربھا کے گھر گئی۔ کھیلتے کھیلتے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ ربھا نے مجھے زور سے مارا اور میں رونے لگی۔ میرا رونا سن کر ربھا کے والد آ گئے۔ انھوں نے ربھا کو ڈانٹا کہ بیچاری کے ماں باپ پہلے ہی جیل میں ہیں اور تم اسے رُلا رہی ہو۔ یہ سنتے ہی میں نے ایک دم سے رونا بند کر دیا اور غصّے میں گرج کر ان سے بولی "ہمیں ترس کی ضرورت نہیں۔ ہم تو بہت خوش ہیں کہ ہماری بی بی جی اور بابو جی دونوں جیل میں ہیں۔ آج کے بعد آپ ہمدردی کی بات نہ کریں۔" میری بات سن کر ربھا کے پتا جی سکتے میں آ گئے۔ اس کے بعد پورے ایک مہینے تک میں ربھا کے گھر نہیں گئی۔

بی بی جی لاہور کی ویمنس جیل میں تھیں اور بابو جی سینٹرل جیل میں۔ دونوں ہی کے خط جیل سے آتے رہتے تھے۔ ہر خط میں یہی لکھا ہوتا کہ وہاں بہت خوش ہیں۔ ان کے خطوں کو ہم بار بار پڑھتے اور پھر سنبھال کر رکھتے۔ اسی طرح کے خط لاجپت رائے بھون کے گرفتار ہونے والے سبھی کانگریسی کارکنوں

کے گھروں میں آتے اور ہم سب بچوں کا کام یہی ہوتا کہ ہم آپس میں مل بیٹھ کر ان خطوں کا چرچا کریں۔

لاجپت رائے بھون ہمیشہ ہی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا تھا، اس لیے وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی میٹنگ ہوتی رہتی تھی۔ ہمارے گھر کے ٹھیک نیچے لالہ اچنت رام جی کے گھر میں کرشن کانت نوجوانوں کی میٹنگ کرتے۔ میں اور سنتوش اوپر روشن دان سے گھنٹوں تک ان میٹنگوں میں ہونے والی باتیں سنتے۔ لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، حالانکہ ہم یہ جانتے تھے کہ انقلابی نوجوان انگریزوں کا تختہ الٹنے کی اسکیم بنا رہے ہیں۔

ہماری بڑی بہن وجے، جس کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس تھی، ان میٹنگوں میں حصہ لیتی تھی، وہ بحث میں شریک ہوتی۔ کئی بار تو باتیں کرتے کرتے غصے سے اس کا منہ تمتما جاتا۔ بہن جی جب گھر آتیں تو ان کے پاس کاغذوں کے پلندے ہوتے جنھیں وہ بہت احتیاط سے چھپا کر رکھتیں تاکہ وہ پولیس کی نظر سے دور رہیں۔ یہ سارے کاغذات، اشتہار اور ان انقلابی نوجوانوں کے سیاسی لٹریچر پر مشتمل ہوتے۔

حالانکہ ہماری نانی جی آزادی کی جد و جہد کے خلاف نہ تھیں، لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ ہماری بہن وجے اس چھوٹی عمر میں ہی پولیس اور جیل کے چکر میں پڑ جائے وہ بہت پیار اور غصے سے انھیں سمجھاتیں اور دھمکاتیں لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ اس سوال کو لے کر اکثر ہمارے گھر میں

جھگڑا ہو جاتا۔ دادی اور نانی ایک طرف ہوتیں اور دوسری طرف وجے۔ ہماری دادی اور نانی مل کر یہی کہتیں کہ تمہارے ماں باپ پہلے ہی جیل میں ہیں، کیا تم بھی جیل جانا چاہتی ہو۔

اُدھر نوجوانوں کی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور ادھر پولیس بھی چوکس تھی۔ ایک دن بھائی کرشن کانت کو پولیس گرفتار کر لے گئی اور اُن کے بہت سے ساتھی بھی گرفتار ہو گئے، لیکن لاجپت رائے بھون میں ہونے والی میٹنگوں کا سلسلہ بدستور چلتا رہا۔ ایک دن ایک نوجوان جب وجے بہن کو میٹنگ میں بلانے کے لیے آیا تو نانی جی نے اسے ڈانٹ کر کہا "وجے تو چھوٹی بچی ہے تم اسے کیوں جیل کے راستے پر ڈال رہے ہو۔" یہ کہہ کر انھوں نے دروازہ بند کر لیا۔ ہماری نانی اور دادی جی دونوں نے وجے بہن جی کو میٹنگ میں جانے سے روکا، لیکن وہ انھیں دھکا دیتے ہوئے دروازہ کھول کر میٹنگ میں چلی گئیں۔ ہماری "بے بے" رو کر یہی کہتیں۔ "نہ جانے یہ آزادی کا پاگل پن کیا ہے کہ چھوٹی سی بچی بھی پولیس سے نہیں ڈرتی اور جیل جانے کے لیے تیار ہے۔"

کرشن کانت ایک ہفتے کے بعد چھوٹ کر آ گئے۔ پولیس نے ان پر بہت ظلم کیے تھے۔ انھیں اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو اُلٹا ٹانگ کر مار لگائی تھی۔ پولیس ان سے ان کے اور ساتھیوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہتی تھی، لیکن انھوں نے پولیس کو کچھ بتانے سے انکار کیا اور مار سہتے رہے۔

ہم بچے گھنٹوں تک کرشن کانت جی سے پولیس کے مظالم کے قصے سنتے رہے۔ بعد میں ہماری اپنی بات چیت کا موضوع بھی یہی رہتا۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ پولیس کے ستانے اور پریشان کرنے کے طریقے کیا ہوتے ہیں۔ جب ہمیں پتہ چلا کہ وہ انقلابیوں کو برف کی بڑی بڑی سلوں پر ننگا کر کے لٹا دیتے ہیں، تو ہم بھی یہ جاننا چاہتے تھے کہ انھیں کیا محسوس ہوتا ہوگا۔ ہم اپنے جیب خرچ کے پیسوں سے بہت سی برف لاتے اور ان پر اپنے بازو اور ٹانگیں رکھ کر محسوس کرنے کی کوشش کرتے کہ انقلابیوں کو کس طرح کا احساس ہوتا ہوگا۔

ہم بچے اکثر سوچتے کہ جب ایک دوسرے سے مار کھا کر ہمارے جسم میں اتنا درد ہوتا ہے تو نہ جانے ان نوجوانوں کو کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہمیں پتہ چلا تھا کہ لاہور کے قلعے میں یہ تمام مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ یہ کام کرنے والے یوں تو سیکڑوں لوگ تھے اور ہمیں ان سب کے نام معلوم نہیں تھے، لیکن ہمیں اتنا ضرور پتہ تھا کہ بابا جگت سنگھ سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر، جو اکثر ہمارے گھر پوچھ تاچھ کرنے آیا کرتا تھا اور بی جی اور بابو جی کی گرفتاری کے وقت بھی موجود تھا، لاہور کے قلعے میں جنگ آزادی کے لیے لڑنے والے لوگوں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا۔ اس لیے جب بھی بابا جگت سنگھ ہمارے گھر آتا، ہم اسے جی بھر کر گالیاں دیتے۔

جب سے لاجپت رائے بھون میں نوجوانوں کی میٹنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا، جس میں وہ جے بہن جی بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں،

تب سے بابا جگت سنگھ کے چکروں کی گنتی بڑھ گئی تھی۔ وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتا۔ جب نانی جی گھر پر نہ ہوتیں تو ہم دروازہ نہ کھولتے اور دیوار پر کھڑے ہو کر یہی کہتے "لوڑی بچہ ہائے ہائے، بابا جگت سنگھ تم خونی ہو۔" لیکن یہ سب سننے پر بھی بابا جگت سنگھ ہم لوگوں سے بہت پیار سے باتیں کرتا۔ ہمیں اس کی شکل سے نفرت تھی ہم اسے منہ چڑاتے اور اسے دیکھ کر آزادی کے نعرے لگاتے تھے۔ اس عمر میں ہمیں اپنی نفرت کے اظہار کا راستہ یہی دکھائی دیتا تھا۔

میرے من میں تو ایک دو بار یہی خیال آیا کہ جب وہ ہمارے گھر میں پانی پیتا ہے تو اس پانی میں کچھ ملا دیں جس سے وہ بیمار ہو جائے لیکن پھر ہمیں اپنے بابو جی کے الفاظ یاد آ جاتے کہ ہمیں ان لوڑیوں پر رحم کھانا چاہیے۔ ہمارے بابو جی اکثر ہمیں بتاتے تھے کہ کس طرح جگہ جگہ ان کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر لگے رہتے اور وہ ان کے ساتھ کس پیار سے بات چیت کرتے۔ ایک بار کا قصہ ہے کہ بابو جی لاہور سے باہر کسی میٹنگ کے لیے گئے اور ایک سی آئی ڈی کا آدمی لگاتار ان کا پیچھا کرتا رہا۔ اس دن بے حد گرمی تھی۔ وہ سی۔ آئی۔ ڈی والا پریشان تھا۔ بابو جی نے اسے بلا کر کہا "سنو دوست! تمہیں اپنا کام کرنا ہے اور مجھے اپنا۔ تم کیوں اس گرمی میں پریشان ہوتے ہو۔ میں رات نو بجے کی گاڑی سے لاہور واپس آ جاؤں گا۔ تم مجھے اسٹیشن ہی پر مل جانا۔ میں تمہیں پوری رپورٹ لکھوا دوں گا کہ میں کہاں کہاں گیا، کس سے ملا، اور کب واپس آیا، میں تمہارا

کام آسان کر دوں گا۔"

ادھر ہماری نانی اور دادی، بہن جی کی سرگرمیوں سے اس قدر پریشان ہو گئیں کہ انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ بہن جی کو کسی ہوسٹل میں بھرتی کرا دیا جائے۔ ہم تینوں بھائی بہن یہ نہیں چاہتے تھے کہ بہن جی ہوسٹل جائیں۔ لیکن ہم یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ بہن جی میٹنگوں میں حصہ لینا چھوڑ دیں۔ سنتوش اور میں جانتے تھے کہ بہن جی کے ہوسٹل جانے کے بعد میٹنگوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

جب ہماری دادی اور نانی پریشان ہو کر رو دیا کرتی تھیں، تب بھی ہمیں بہت برا لگتا تھا۔ ایک دن میں نے بہن جی سے کہا کہ آپ یہ کوشش کیوں نہیں کرتیں کہ دے دے اور نانی جی کو ناراض نہ کریں، تو وہ بہن جی ناراض ہو گئیں۔ میری بات سنتے ہی انھوں نے مجھے تین چار تماچے رسید کیے، لیکن میں روئی نہیں۔ مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ سنتوش نے مجھے بہت ڈانٹا کہ میں نے ایسی بات کیوں کی۔

میں اور سنتوش بھی بہن جی کے کام میں پورے طور پر مددگار تھے۔ ہمارا کام گوبر کے اپلوں کے ڈھیر میں خفیہ کاغذوں کو چھپانا ہوتا تھا۔ ایک بار ایسے ہی کچھ کاغذ چھت پر پڑے ایک پرانے گھڑے میں ڈال دیئے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ اس میں پیلے رنگ والی بھڑوں نے ایک بڑا سا چھتّہ بنا رکھا تھا۔ جب مجھے بہن جی نے ان کاغذوں کو لانے کے لیے کہا تو میں نے دیکھا کہ گھڑے کے پاس سیکڑوں بھڑیں اڑ رہی ہیں۔ میں نے ہاتھ اور منہ پر کپڑا لپیٹ کر اس گھڑے میں سے کاغذ نکالے۔ بھڑوں کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بہت سی بھڑوں نے مجھے کاٹ بھی

کھایا۔ اس دن سارا منہ اور ہاتھ پیر بھڑوں کے زہر کی وجہ سے بڑی طرح سوج گئے تھے۔

ہماری نانی جی نے بہت سے لوگوں کے ساتھ مشورہ کر کے وجے بہن جی کو ہنس راج محلہ کالج کے بورڈنگ میں داخل کروا دیا۔ اس وقت وہ ساتویں کلاس میں تھیں۔ کالج کی پرنسپل مس پریم دتی تھاپر تھیں۔ انھیں ڈر تھا کہ انقلابی وجے اسکول میں اُدھم مچائے گی۔ لیکن تھاپر ہمارے والدین کی اتنی عزت کرتی تھیں کہ وجے کو ہوسٹل میں داخل کرنے سے انکار نہیں کر سکیں۔

مس پریم دتی تھاپر کا خطرہ صحیح نکلا، وجے نے ہوسٹل میں پہنچتے ہی طوفان کھڑا کر دیا وہاں میٹنگوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ہنس راج مہیلا کالج سے اکثر "انقلاب زندہ باد" کے نعرے سنائی دینے لگے۔ ہر روز نانی جی کو رپورٹ ملتی کہ آج وجے نے لڑکیوں کی میٹنگ بلائی تھی اور ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم ان رپورٹوں کو سن کر بہت خوش ہوتے اور ہمیں اپنی بڑی بہن پر فخر ہوتا لیکن گھر میں ودے دے اور نانی جی پریشان تھیں اور اُدھر کالج کی پرنسپل مس تھاپر بھی۔ آخر ایک دن وجے بہن جی نے دھماکہ کر ہی ڈالا وہ تیس لڑکیوں کے ایک جلوس کو لے کر ہوسٹل کی دیوار پھاند کر سڑک پر آ گئیں اس جلوس میں وہ سب سے کم عمر کی تھیں۔

ان دنوں لاہور میں دفعہ ۱۴۴ لگی تھی اور ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی تھی۔ ان تیس لڑکیوں کی گرفتاری کی گئی، جب نانی جی کو پتہ لگا تو انھوں نے سر تھام لیا۔ کہنے لگیں "میں وجے کو کیسے روک سکتی تھی آخر ہے تو وہ سیتا کی بیٹی"

ہم لوگ بہت خوش تھے کہ ہماری بہن نے اس چھوٹی سی عمر میں جلوس کی رہنمائی کر کے جیل جانے کی خوش قسمتی حاصل کی۔

ان لڑکیوں کو بھی لاہور کی اسی جیل میں لے جایا گیا جہاں ہماری بی بی جی قید تھیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ لڑکیوں کو الگ الگ کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ہم لوگ بھی یعنی سنتوش، میں اور نانی جی جیل پہنچے۔ جیل ہمارے گھر سے کوئی دس بارہ میل دور ہوگا۔ ان دنوں تانگہ ہی ایک سواری تھی جس پر بیٹھ کر کہیں آجا سکتے تھے۔ جیل تک پہنچنے میں ہمیں ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت لگا۔ میں اور سنتوش بے صبری سے وہاں پہنچنے کا انتظار کر رہے تھے۔

جب ہم جیل پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ جیل کے پھاٹک کے باہر ایک پورا ہنگامہ تھا۔ سبھی لڑکیوں کے ماں باپ اور دوسرے رشتہ دار وہاں جمع تھے۔ انھیں اپنی بیٹیوں سے ملنے کی اجازت دی گئی تھی۔ تقریباً سبھی ماں باپ اپنی اپنی بیٹیوں کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ معافی مانگ لیں۔ لڑکیاں زور زور سے چلاّ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ وہ معافی نہیں مانگیں گی۔ وہ جیل ہی میں رہنا چاہتی ہیں۔ ادھر ماں باپ تھے کہ رو بھی رہے تھے، دھمکا بھی رہے تھے اور چلاّ بھی رہے تھے۔

اس بھیڑ میں جمع سبھی لوگ بار بار وِجے کا نام لے رہے تھے کہ اس نے ہی باقی لڑکیوں کو اکسایا تھا۔ آخر میں ماں باپ کے بہت دباؤ اور دھمکانے کے بعد اٹھائیس لڑکیوں نے لکھ کر معافی مانگ لی اور ان کو رہا کر دیا گیا۔ اپنے معافی نامے میں انھوں نے یہ بھی لکھا کہ پھر کبھی اس قسم کی

سیاسی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیں گی۔

وجے بہن جی اور ایک دوسری نوجوان خاتون، جس کا نام رام پیاری تھا لیکن جسے سب پیاری کہتے تھے، نے معافی نہیں مانگی۔ ہم نے دیکھا کہ پیاری کے ماں باپ اسے بار بار معافی مانگنے کو کہتے، لیکن وہ جیل کے پھاٹک کی سلاخوں کے ساتھ سر ٹپک ٹپک کر کہتیں کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ بار بار پیاری کی یہی آواز سنائی دیتی کہ میں جان دے دوں گی، لیکن معافی نہیں مانگوں گی۔

وجے بہن جی سے کسی نے معافی مانگنے کے لیے کہا ہی نہیں۔ جب ہم ان سے ملنے گئے تو وہ ہنستی ہوئی بہت فخر کے ساتھ ہم سے ملنے آئیں۔ ہماری نانی جو اور دوسرے رو رہی تھیں، لیکن وجے بہن جی بہت خوش تھیں اور خود کو ایک بہت بڑے ڈرامے کی ہیروئن محسوس کر رہی تھیں۔ نانی جی نے ان سے پوچھا کیا تمہیں جیل کی روٹی اچھی لگتی ہے، تو وہ ہنس کر کہنے لگیں کہ "ماتاجی آپ بھی کھا کر دیکھیے کہ جیل کا کھانا گھر سے کہیں زیادہ مزیدار ہے۔" ہماری دادی روتے ہوئے پوچھنے لگیں کہ کیا تمہیں اکیلی کوٹھری میں ڈر نہیں لگتا، بہن جی بہت شان سے کہنے لگیں "ڈر کی بھلا کیا بات ہے۔ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ جیل اتنی مزیدار جگہ ہے۔" پھر مجھے بہن جی نے بہت دلچسپی سے جیل کے بارے میں باتیں بتائیں اور سنتوش اسی تصور میں ڈوب گئے کہ کاش وجے بہن جی کی طرح ہم دونوں بھی جیل جا سکتے۔

وجے بہن جی کو جیل کی ایسی کوٹھری میں رکھا گیا جہاں پھانسی کے قیدی رکھے جاتے تھے۔ یہ کوٹھری بی بی جی کی 'بیرک' سے بہت دور تھی کیوں کہ

بی بی جی ان سیاسی قیدیوں میں سے تھیں جن پر بنا کوئی مقدمہ چلائے جیل میں رکھا گیا تھا اور جن کی قید کی کوئی میعاد مقرر نہ ہوئی تھی۔ جب ہم کچھ دن بعد بی بی جی سے ملاقات کرنے گئے تو انھوں نے مجھے بتایا کہ بہت سی عورتیں ان سے یہی کہتی ہیں کہ تم کتنی پتھر دل ہو، کیا تمھارا من پریشان نہیں ہوتا کہ تمھاری چھوٹی سی بچی جیل میں ہے۔ بی بی جی کہتیں کہ دبجے کا جیل میں جانا میرے لیے فخر کی بات ہے، پھر میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی جس سے دبجے کا قدم ڈگمگا جائے۔

لاہور کی خواتین کے لیے بنائی گئی اس جیل میں ان سیاسی قیدیوں کے علاوہ بہت سی دوسری قیدی عورتیں بھی تھیں جو بہت سے جرائم کے سلسلے میں جیل کاٹ رہی تھیں۔ ان عورتوں کو سیاسی خواتین قیدیوں کے لیے کام پر لگا دیا جاتا تھا وہ ان کا کھانا پکاتیں، کپڑے دھوتیں اور ان کے گھر کی صفائی کرتیں۔ جب ان عورتوں کو پتہ چلا کہ بی بی جی کی چھوٹی بیٹی جیل میں ہے تو وہ ان سے کہتیں کہ کوئی اچھی سی چیز پکا دو ہم تمھاری بچی کو دے آئیں گے۔ لیکن بی بی جی نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر انھوں نے جیل میں دبجے کے ساتھ اس طرح سے لاڈ پیار کیا تو ان کی ممتا، ان کی بچی کو کمزور بنا دے گی۔

بی بی جی نے دبجے بہن جی سے ملنے تک کی کوشش نہیں کی۔ ہماری بہن جیل کے ساتھ ساتھ سارے لاہور میں چرچا کا موضوع بن چکی تھی۔ سبھی کو حیرت تھی کہ اتنی کم عمر کی بچی جیل میں سزا کاٹ رہی ہے۔

ہمیں ہر دوسرے تیسرے دن جیل کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہتا۔ اپنے ماں باپ کی غیر حاضری میں جیل کی یہ باتیں ہمارے لیے بہت بڑا سہارا تھیں۔ ہمارا بہت سارا وقت انھیں باتوں کو دہرانے میں گزرتا۔ یہ باتیں بہت فخر سے ہم دوسرے لوگوں کو سناتے ہمارے گھر میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور وہ آکر ہماری نانی اور دادی سے وِدیہ بہن جی سے متعلق ڈھیروں سوال پوچھتے۔

جیل میں وِدیہ بہن جی کی ہمت کو دیکھ کر سبھی لوگ دانتوں تلے انگلی دباتے۔ وہ وہاں بہت خوش تھیں۔ اپنی مزیدار باتوں سے ہر ایک کو ہنساتیں۔ ان کی آواز بہت اچھی تھی اور وہ کوٹھری کے اندر اونچی آواز میں وطن پرستی کے گانے گاتی تھیں۔ ان کے دو گانے جیل میں بہت مشہور ہو گئے تھے اور اب تو جیل کی عام قیدی عورتیں بھی ان گیتوں کو گنگنانے لگی تھیں۔ ایک گانا تھا "انقلاب زندہ باد۔ گونجے آزادی کا ناد۔ لاٹھی گولی سنگٹ جیل۔ ظالم کا ہے انتم کھیل۔ انقلاب زندہ باد"

دوسرا گانا تھا۔

"آزاد کریں گے، ہند تجھے آزاد
ہم ہندی ہیں اور کچھ بھی نہیں
اور کچھ بھی نہیں گر ہندی نہیں
یہ ہند رہے آباد"

لاہور میں خواتین جیل کی سپرنٹنڈنٹ مسز سوداگر سنگھ بھی کہا

کرتیں، نہ جانے یہ سیاسی کارکن کس مٹی کے بنے ہیں کہ جو کبھی گلنے یا گھلنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ہم جب بھی جیل ملاقات کے لیے جاتے، ہماری ملاقات بی بی جی سے ہوتی۔ ندجے بہن جی کو چھ مہینے کی سزا ہوئی تھی اور ان سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نانی جی سے کہتیں کہ آپ نے کیسی اولاد پیدا کی ہے۔ جو پتھر کی چٹان سے بھی زیادہ سخت ہے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ مسز سوداگر سنگھ نے بار بار ہماری نانی جی سے کہا کہ وہ بی بی جی کو سمجھائیں کہ وہ ندجے کو معافی مانگنے کے لیے کہیں، لیکن ہماری نانی جی ہمیشہ یہی جواب دیتیں "آپ جس ماحول میں رہتی ہیں، وہاں آپ ہم لوگوں کے جذبات کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ میں سیتا کو ایسی بات کس منہ سے کہوں کہ وجے کو معافی مانگنے کے لیے کہے۔ مجھے کہتے ہوئے خود شرم آتی ہے۔ میری وجے بہادر ہے۔ وہ جیل میں گھبراتی نہیں، بہت خوش ہے، پھر آپ کیوں پریشان ہیں۔" یہ سن کر جیل سپرنٹنڈنٹ چپ رہ جاتیں لیکن ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ ہمارے پورے خاندان کو پاگل سمجھتی ہیں۔ جب کبھی ہم اپنی ماں سے ملنے جیل جاتے تو بڑے پھاٹک کے اندر کی دنیا کو حسرت سے دیکھتے رہتے۔ ملاقات ہمیشہ سپرنٹنڈنٹ کے دفتر کے ساتھ بنے ملاقاتیوں کے کمرے میں ہوتی۔ اس کے چاروں طرف پولیس والوں کا پہرہ رہتا۔ میں وہاں بیٹھے بیٹھے سوچتی کہ جیل کی دنیا نہ جانے کیسی ہوگی۔ ایک بار سنتوش، بی بی جی کے ساتھ دس منٹ کے لیے جیل کے اندر چلی گئی۔ واپس آکر اس نے بتایا کہ اندر ایک مکان ہے،

ایک بڑی بیرک کے اندر بی جی کے پاس ایک کمرہ ہے۔ چاروں طرف کھلا میدان ہے جیل کوئی خوفناک جگہ نہیں ہے۔ وہاں ہر وقت خاموشی رہتی ہے۔ جیل سے واپس آنے کے بعد بھی میں اس سے جیل کے بارے میں ہر روز سوال پوچھتی اور وہ مجھے ہر روز کوئی نئی بات بتاتی۔ میں خود جاکر جیل دیکھنا چاہتی تھی۔ جیل سے بابوجی کے خط بھی آتے رہتے۔ وہ ہمیشہ یہی لکھتے کہ ہمیں بہادر بچوں کی طرح رہنا چاہیئے اور کبھی اداس نہیں ہونا چاہیئے۔ ایک خط میں بابوجی نے جیل میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہوئے مذاق کی باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا کہ میں یہاں بہت خوش ہوں، لیکن تم لوگوں کی بات بہت یاد آتی ہے۔

کچھ دن لاہور جیل میں رہنے کے بعد بابوجی اور کچھ دوسرے سیاسی قیدیوں کو شاہ کوٹ پھر ملتان اور اس کے بعد میاں والی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ میاں والی میں ہمارے بابوجی کے ماموں بھی رہتے تھے۔ وہیں سے بابوجی نے اپنے خط میں لکھا تھا "انگریزوں نے ہماری بی جی کے ساتھ خاص رعایت کی ہے کہ انھیں لاہور جیل میں رکھا ہے۔ ہم تو سوتیلے ہیں اور وہ بھی خطرناک۔" پھر بابوجی اپنے خطوں میں اپنے سبھی ساتھیوں کا ذکر کرتے جن میں کامریڈ رام کرشن (جو بعد میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ بھی بنے اور آج کل دلّی میں جنگ آزادی کے سپاہیوں کی کمیٹی کے سرگرم کارکن ہیں) مرحوم لالہ اچنت رام اور مرحوم لالہ موہن جی کے بارے میں بھی خاص طور پر ان خطوں میں ذکر ہوتا۔ ان لوگوں کو ہم چچا کہتے تھے اس زمانے

میں سبھی سیاسی کارکن خود کو ایک بڑے خاندان کا حصہ سمجھتے تھے۔

جب بھی جیل سے خط آتا تو لاجپت رائے بھون کے سبھی گھروں میں اُسے پڑھا جاتا۔ سبھی خاندان ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ کے ساتھی تھے۔ مجھے ایسا کوئی دن بھی یاد نہیں آتا کہ اگر کسی ایک گھر میں چولھا نہیں جلا تو وہاں کے لوگ بھوکے رہے ہوں۔ جب ہماری ماں گھر میں اکیلا چھوڑ کر میٹنگوں کے لیے چلی جاتی تھی تو ہمیں پل بھر کے لیے یہ خیال نہ آتا تھا کہ ہم کھانا کہاں کھائیں گے۔ سبھی پڑوسیوں کا گھر ہمیں اپنے گھر کی طرح معلوم دیتا تھا۔ وہ بھی ہمیں اپنے بچوں کی طرح سے پیار کرتے تھے۔ ہم وہیں کھانا کھاتے، کھیلتے اور سو جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم لالہ اچنت رام جی گھر رات کا کھانا کھا کر سو گئے۔ صبح ہونے پر پتہ چلا کہ ہماری ماں رات بہت دیر سے میٹنگ سے آئی تھیں اور صبح پھر چلی گئیں۔ ہمیں یہ جان کر مایوسی نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ہی ہم اداس ہوتے تھے کیونکہ لاجپت رائے بھون میں رہنے والے ہم سبھی بچے ایک دوسرے کو بھائی بہن سمجھتے تھے۔ جتنا پیار اور اپنا پن ہمیں اپنے ان پڑوسیوں سے اس وقت ملا، اس کا بیان کرنا آسان کام نہیں ہے۔ آج اتنے سال گزر جانے پر بھی ان سبھی لوگوں کے لیے پیار کا جذبہ دل میں موجود ہے۔ بار بار یہی احساس ہوتا ہے کہ یہ سب ہمارے اپنے بھائی بہن تھے جن کے ساتھ ہم نے اپنی خوشیاں، مسکراہٹیں اور آنسو سبھی کچھ بانٹا تھا۔

ہماری بال سبھا

آج کے بچوں کا بچپن دیکھ کر کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ ہم بچوں کا بچپن ان سے کتنا الگ تھا۔ ہم بچے ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتے بھی تھے، لڑتے جھگڑتے بھی تھے، لیکن ملک کو آزاد کروانے کا جذبہ پل بھر کے لیے بھی دل سے جدا نہ ہوتا تھا۔ اگر کسی بچے سے جھگڑا ہوتا تو ہم اسے ٹوڈی کہہ کر گالی دیتے کیونکہ ہم بچوں کی نظر میں ٹوڈی سے بڑی گالی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ہمیں اس بات پر فخر تھا کہ ہم کانگریسی ماں باپ کے بچے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے تھے کہ کانگریسی ہونے کا مطلب قربانی کرنے سے ہے۔ ہمیں یہ بتایا گیا تھا کہ بڑے سے بڑے انگریزوں کے پٹھو بھی اپنے دلوں میں اس بات کو سمجھتے ہیں کہ کانگریسی کتنی بڑی قربانی کر رہے ہیں۔ پھر ہم بچوں کو اس وقت کی سیاست کی تمام باتوں سے گہری دلچسپی تھی۔ کیونکہ ہمارے چاروں طرف کا ماحول ہی ایسا تھا کہ ہر وقت سیاسی باتیں ہی ہوتیں۔ ہم جب صبح شام سیر کرنے جاتے یا مل بیٹھ کر کھیلتے تو یہی

باتیں کرتے کہ انگریز بہت برے ہیں اور نہ جانے ملک آزاد کروانے کے لیے ہم لوگوں کو کتنی قربانی دینی ہوگی۔ آزاد ہندوستان کا ایک حسین تصور ہم سب بچوں کے ذہن میں تھا۔

ہم بچوں نے مل کر لاجپت رائے بھون میں ایک بال سبھا بنائی تھی۔ ہر ہفتے بچے ایک جگہ جمع ہوتے۔ سبھی اپنے جیب خرچ میں سے پیسے دے کر میٹنگ کرتے۔ پہلے سیاسی گفتگو ہوتی اور پھر کچھ کھانا پینا ہوتا۔ کیونکہ لاجپت رائے بھون میں بڑے بڑے لیڈر اکثر موجود رہتے، اس لیے ہم کسی نہ کسی کو اپنی میٹنگ میں ضرور بلا لیا کرتے تھے، یہ لوگ بھی آتے تو آکر ہم سے یہی باتیں کرتے کہ ملک کو آزاد کروانے کے لیے ہم سب کو بہت کچھ قربانی دینی ہوگی۔ ہم بچوں کے سامنے آزاد ہندوستان کا ایک خوبصورت نقشہ پیش کیا جاتا۔ ہم سبھی بچے اسی تصور میں ڈوبے رہتے کہ جب ملک آزاد ہوگا تو وہاں کسی پر ظلم نہ ہوگا، سبھی کو برابر کے حقوق ملیں گے یوں کہیے کہ ایک سوشلسٹ سماج کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچا رہتا۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ ایک بار ہندوستان آزاد ہو گیا تو وہ انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کا رشتہ نہ رکھے گا اور انگریزوں کو بھی احساس ہوگا کہ اپنی آزادی کے لیے مرمٹنے والے ہندوستانیوں میں کتنی انا ہے۔ اس وقت ہمیں یہ احساس نہ تھا کہ ہندوستان کامن ویلتھ (دولتِ مشترکہ) کا ممبر بنے گا اور آزادی کے بعد بھی انگریزوں کی ذہنی غلامی سے رہائی نہ مل سکے گی۔ ہم بچوں نے تو یہ سوچا بھی نہ تھا کہ آزاد ہندوستان

کا پہلا گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہوگا۔ نہ جانے ہم بچے اس وقت کس دُنیا میں ڈوبے رہتے اور آزاد ہندوستان کے آزاد ہندوستانیوں کی خودداری کا تصور کرتے رہتے۔ اکثر بال سبھا میں ہم اس موضوع پر بھی بات چیت کرتے کہ آزاد ہندوستان کیسا ہو۔

بال سبھا میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بچوں کی اپنی ایک میگزین ہونی چاہیے۔ ہم جانتے تھے کہ میگزین پر بہت خرچ آئے گا۔ ہمارے پاس اتنے پیسے جمع نہ ہوتے تھے کہ ہم اس کا خرچ اٹھا سکتے۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی فیصلہ کیا گیا کہ میگزین ہاتھ سے لکھی جائے۔ ایک جیسے سائز کے بڑے کاغذوں پر ہر کوئی اپنا مضمون یا نظم اپنے ہاتھ سے لکھتا یا دوسروں سے لکھواتا اور پھر ان تمام لکھے کاغذوں کو ایک میگزین کی شکل میں سلوا دیا جاتا اور اس پر گتے کی جلد بنوادی جاتی۔ لیکن یہ میگزین دو شماروں سے زیادہ نہیں نکل پائی کیونکہ ہم سبھی بچوں کی لکھائی اچھی نہ تھی۔

پھر ہماری بال سبھا بھی آہستہ آہستہ بکھرنے لگی۔ جہاں پہلے کبھی بال سبھا کے تیس ممبر ہوتے تھے، اب وہ کم ہو کر محض بیس رہ گئے تھے کیونکہ بہت سے بچے جو لاجپت رائے بھون میں نہیں رہتے تھے۔ اور ہماری بال سبھا کی میٹنگوں کے لیے دور سے آتے تھے، انھوں نے آنا بند کر دیا تھا۔ ان کے ماں باپ کا کہنا تھا کہ بال سبھا کانگریسیوں کی ہے اور اگر ان کے بچے اس میں شرکت کریں گے تو کل پولیس آکر پریشان کرسکتی ہے۔

جب ہمیں اس بات کا پتہ چلا تو پہلے ہم نے ایسے والدین کو "ٹوڈی" 'انگریزوں کے پٹھو' اور 'آزادی مخالف' کہہ کر بُرا بھلا کہا، لیکن بعد میں ہماری بال سبھا میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہم ان بچوں کو لانے کے لیے اُن کے گھر جا کر ان کے والدین کو سمجھائیں گے کہ اگر ان کے بچے بال سبھا میں جائیں گے تو انھیں پکڑ کر جیل میں نہیں لے جایا جائے گا۔ یہ کام کرنے کے لیے چار بچوں کا ایک ڈیلیگیشن بنایا گیا جس میں میری بہن سنتوش اور خود میں بھی شامل تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے تو ہم ان بچوں کی ماؤں کو سمجھائیں گے اور اگر وہ نہ سمجھیں تو بعد میں ان کے باپوں کے پاس جائیں گے۔

آج ہم اپنی اسی ہمت کے بارے میں سوچتے ہیں تو ہنسی آتی ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں بھی ہم لوگ کیسی کیسی باتیں اور دلیلیں سوچا کرتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ جن لوگوں سے جا کر ہم یہ باتیں کرتے ہوں گے وہ ضرور ہم پر چھوٹا منہ بڑی بات کہہ کر ہنستے ہوں گے۔

ہماری سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ یہ والدین آج اپنے بچوں کو ہماری بال سبھا میں نہیں آنے دیں گے تو کل جب ہندوستان آزاد ہوگا تو آزاد سرکار ان ٹوڈیوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ ہمیں اس بات پر یقین تھا کہ آزاد ہندوستان میں ٹوڈیوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوگا۔ اس وقت ہمارے ننھے دماغوں کو اس بات کا احساس نہ تھا کہ کانگریس کی حکومت میں بھی ٹوڈیوں کی پہلی طرح بن آئے گی اور وہ لوگ دوبارہ حکمراں ہوں گے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر اس بات کی کوشش

کی تھی کہ ہندوستان آزاد نہ ہو اور جو ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی اپنے بھائیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ہماری بال سبھا کی ڈیلیگیشن کو زیادہ کامیابی اس لیے بھی نہیں ملی کیونکہ بال سبھا میں آنے والے بچوں میں اکثریت ان بچوں کی تھی جن کے والد سرکاری ملازم تھے۔ بچوں کی ماؤں نے ہمیں یہ کہہ کر بھگا دیا "تمہاری بال سبھا کے پیچھے ہم جیل کے دھکے نہیں کھا سکتے۔" لیکن جب ہم نے مردوں سے بات کی تو انھوں نے بہت پیار سے ہم سے کہا کہ ہم ملک کی آزادی کے حمایتی تو ہیں لیکن اس وقت سوال روٹی کا ہے۔ سنت نگر میں رہنے والے ایک کلرک نے جن کی بیٹی بہت شوق سے ہماری بال سبھا کی میٹنگوں میں آیا کرتی تھیں، ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔" تمہارے ماں باپ کا کیا ہے۔ ان کا تو پیشہ ہی جیل جانا ہے تمہیں کانگریس سے روٹی مل جاتی ہے لیکن ہم اپنے بچوں کا پیٹ کہاں سے بھریں گے۔ ہم آزادی کے ترانے نہیں گا سکتے۔" یہ سن کر ستنتوش کو غصہ آگیا۔ وہ بولی "اگر آپ سرکاری نوکری چھوڑ دیں تو میں اپنے بابوجی سے کہہ کر آپ کو بھی کانگریس سے روٹی دلوا دوں گی۔"

ایسے بہت سے بچے پھر واپس بال سبھا میں نہیں آئے۔ لیکن ہماری بال سبھا بدستور چلتی رہی کیونکہ لاجپت رائے بھون میں ہی بہت سے بچے موجود تھے اور وہاں آئے دن کوئی نہ کوئی جلسہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ ہم لوگ شام کو جلدی کھانا کھا کر لاجپت رائے بھون کی گیلری میں بیٹھ جاتے اور وہاں اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک جلسہ ختم نہ ہو جاتا۔

اکثر بچوں کی آنکھوں میں نیند بھری رہتی لیکن ہم اس میٹنگ کو چھوڑ کر جانا بھی نہیں چاہتے ۔ ہمیں احساس تھا کہ یہ میٹنگیں جنگ آزادی کا اہم حصہ ہیں ۔

جہاں کہیں بھی کوئی عام جلسہ ہوتا، ہم بچے وہاں ضرور جاتے ۔ حالانکہ کچھ کانگریسی لیڈر ایسے تھے جن کی لمبی لمبی تقریریں ہمیں بہت بور کرتیں ۔ جونہی وہ اسٹیج پر آتے ہمیں معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنی تقریر کس طرح سے شروع کریں گے اور اس میں کیا کیا کہیں گے ۔ ان جلسوں میں کبھی کبھی ہم میں سے کچھ بچے بھی اپنی نظمیں پڑھتے ۔

سنتوش اور میں اکثر ٹوڈی اور کانگریسی کا پورا ڈرامہ کئی میٹنگوں میں گا کر سنا چکے تھے ۔ ایک بار ہم اپنے بابو جی کے ساتھ مغربی پنجاب میں لہیہ نام کے شہر میں ہوئی ایک کانفرنس میں گئے وہاں ہمیں یہ ٹوڈی ن کانگریسی کا ڈرامہ تین چار جگہ گا کر سنانا پڑا ۔ بار بار یہی فرمائش آتی کہ ٹوڈی کانگریسی کا گانا سنوائیے ۔ رات کے بارہ بجے ہم دونوں بہنیں اسٹیج پر سو چکی تھیں ۔ لیکن ہمیں جگایا گیا اور ہزاروں لوگوں کی فرمائش پر آنکھیں ملتے ہوئے ہم نے پھر سے ٹوڈی کانگریسی کا ڈرامہ شروع کر دیا ۔ مجھے اس بات کی شکایت تھی کہ سنتوش خود تو کھادی کا کرتہ پاجامہ پہن کر اور سر پر گاندھی ٹوپی لگا کر کانگریسی بن جاتی اور مجھے پینٹ کوٹ اور ٹائی پہن کر ٹوڈی کا رول ادا کرنا پڑتا ۔ لیکن سنتوش کسی قیمت پر بھی ٹوڈی کا رول ادا کرنے کو تیار نہ ہوتی ۔ مجھے بابو جی سمجھاتے کہ تم سچ مچ ٹوڈی تو ہو نہیں تم تو محض ٹوڈی کی ایکٹنگ کر رہی ہو اور

اگر تم ٹوڈی کا رول نہیں کرو گی تو ڈرامہ کیسے پورا ہوگا اور لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ ٹوڈیوں اور کانگریسیوں میں کیا فرق ہے۔

ہماری ٹوڈی اور کانگریسی کی گفتگو کچھ اس طرح سے تھی:

ٹوڈی: جیہڑے سرکار دی بیتیاں دے نال لڑدے
اوہو گاندھی دے دیوانے جیلاں وچ سڑدے

کانگریسی: ٹوڈی بولیاں نہ مار ساتھوں تیر وجدے
جیہڑے گاندھی جی دے چیلے ساڈے ویر لگدے

ٹوڈی: ساتوں ٹوڈی ٹوڈی کہندے نالے تک تک گڑدے رہندے
ایسی چھوٹے صاحب دے بنگلے جدوں ہاں وڑدے

کانگریسی: تینوں کیوں نہ کہئیے ٹوڈی تیری کسمت روڈی ہوڈی
سن لے دیش دی آزادی والے نعرے وجدے

ٹوڈی: پا کے ہیٹ کوٹ تے پینٹ اسی چلتے اینٹ اینٹ
تسی گاندھی ٹوپی پا کے ساڈا پانی بھردے

کانگریسی: پا کے سوٹ تو لگیا ہویا، نا تو ہنس تے نا تو کوا
اسی کھدر دھاری تینوں دیش دا ودوہی سدّے

ٹوڈی: پنجابی بھاشا کرما ماری اے نال بولی ہے گنواری
اسی گٹ مٹ گٹ مٹ کر کے جنٹلمین کردے

کانگریسی: چھوڑو گٹ مٹ دی کٹکار کرلو آزادی دا پرچار
سن لو دیش دی آجادی دے نعرے لگدے

آزادی کا بے صبری سے انتظار

جلسوں اور ہر طرح کی میٹنگوں میں اپنے ماں باپ کے ساتھ جانا ہم اپنا حق سمجھتے تھے۔ اگر کبھی ماں ہمیں اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کرتیں تو ہم رو رو کر اپنا برا حال کر لیتے۔ ہمارے سامنے زندگی کی سب سے بڑی کشش ان میٹنگوں میں جانا ہوا کرتی تھی ٹھیک اسی طرح جس طرح آج بچوں کے لیے سنیما میں بھاری کشش ہے۔

یہ سیاسی جلسے رات بارہ بجے تک چلتے رہتے کیونکہ ان کی شروعات رات کے نو بجے کے بعد ہی ہوا کرتی تھی۔ ہم بہت خوشی سے ان جلسوں میں جاتے، لیکن وہاں اکثر بیچ ہی میں سو جاتے تھے۔ ہم سوتے رہتے اور جلسہ ختم ہونے پر جگا دیا جاتا۔ یہ لکھتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے آج بھی لاہور کا بریڈلا ہال آجاتا ہے جہاں اکثر کانگریس کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد تھا کہ بریڈلا ہال کا کون سا کونا سب سے اچھا تھا۔ یہاں سردیوں میں ہم آرام سے لیٹ کر ان میٹنگوں کی

تقریریں سنا کرتے تھے۔

اگر ہمارے ہمارے سامنے میٹنگوں میں جانے یا گھر رہ کر ایک روپیہ خرچ کرنے کی بات ہوتی تو ہم ہمیشہ میٹنگوں میں ہی جانا پسند کرتے تھے، حالانکہ آج سے چالیس سال پہلے ایک روپے کی بہت قیمت تھی اور جس بچے کو ایک روپیہ مل جاتا وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھتا تھا کیونکہ ایک روپے سے ان دنوں بہت کچھ خریدا جا سکتا تھا۔

ان دنوں لاجپت رائے بھون میں رہنے والے ہم بچوں کے لیے ۲۶ر جنوری کا دن بہت اہمیت رکھتا تھا اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم اس دن کو دیوالی، دسہرا، عید یا بیساکھی سے کم اہمیت نہ دیتے تھے۔ ۲۶ر جنوری کا ہم بے صبری سے انتظار کرتے اور دسمبر کے مہینے سے ہی اس کے لیے تیاریاں شروع کر دیتے۔ اس دن کے پروگرام کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی تیاریوں میں گہری دلچسپی دکھائی جاتی۔ لاہور میں جنوری کا مہینہ بلا کی سردی کا ہوتا تھا۔ ان دنوں صبح کے وقت بہت گہرا کہرا ہوتا تھا اور سردی سے دانت بجتے تھے۔ لیکن اس خوفناک اور سخت سردی میں بھی ہم صبح چار بجے اٹھ کر بیٹھ جاتے اور نہا کر اس دن کے لیے خاص طور پر سلوائے گئے سفید کھادی کے کپڑے پہن کر تیار ہو جاتے۔

ان دنوں ہمیں یہ خیال بھی رہتا کہ بنا نہائے دھوئے کوئی بھی اہم کام نہیں کرنا چاہیے۔ ۲۶ر جنوری سے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ہم پربھات پھیریوں میں شامل ہوتے جو صبح چار بجے نکلتی تھیں۔ صبح سویرے لوگ

مل کر ایک جلوس کی شکل میں گلیوں میں گھوم کر آزادی کے گانے گاتے ہوئے نعرے لگاتے۔ ان پربھات پھیریوں میں بہت سے لوگ اپنے اپنے گھروں سے شامل ہوتے جاتے۔ جب ابھی رات کا اندھیرا موجود ہوتا تب ہی پربھات پھیریاں نکلتیں۔ سب سے پہلا گانا ہوتا:

"اٹھ جاگ مسافر بھور بھئی —
اب رین کہاں جو سووَت ہے
جو سووَت ہے سو کھووَت ہے
جو جاگت ہے سو پاوَت ہے" ہم بچوں میں

اتنا جوش ہوتا کہ اسے دیکھ کر خود ہمارے ماں باپ کو بھی یہ خیال نہ آتا کہ ہم اتنی سردی میں بیمار ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے کبھی ہمیں ان پربھات پھیریوں میں جانے سے نہیں روکا۔

۲۶ جنوری کے دن جب صبح ترنگا لہرایا جاتا تو ہم اونچی آواز سے اکثر یہ تین گانے گاتے:

۱ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"
۲ "وجئی وِشو ترنگا پیارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

اور تیسرا گانا ہوتا "وندے ماترم" اس وقت ہم بچے یہی سوچتے کہ ۲۶ جنوری ۱۹۲۹ء کو پنڈت جواہر لال نہرو نے لاہور ہی میں راوی کے کنارے ہوئے کانگریس کے اجلاس میں مکمل آزادی کا

نعرہ لگایا تھا۔ ہم بچوں کو یہ یقین تھا کہ اگر ہم ۲۶ جنوری کے دن دل وجان سے نعرے لگائیں گے اور گانے گائیں گے تو ہمیں آزادی جلدی مل جائے گی۔

ان دنوں ہمارے لیے سب سے بڑی فیشن کی چیز ترنگی قمیص اور سویٹر پہننا تھی۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کھادی کے علاوہ کوئی اور کپڑے ہمیں پہننا چاہئیں۔ ان دنوں کھادی کا سوٹ آج کی طرح مہین نہیں ہوتا تھا۔ وہ بہت موٹا اور کھردرا ہوتا تھا۔ لیکن وہ موٹی کھردری کھادی ہمارے لیے بہت فخر کی چیز تھی۔

لاجپت رائے بھون میں سبھی کانگریسی گھروں میں چرخے موجود تھے اور سبھی لوگ کچھ نہ کچھ وقت نکال کر سوت کاتا کرتے تھے۔ اس وقت چرخے پر سوت کاتنا باقاعدہ پارٹی کے ڈسپلین کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ نئے فیشن کے چرخے بھی آ گئے تھے جو سائز میں بہت چھوٹے تھے اور جنھیں ہماری دادی مشین کہا کرتی تھیں کیونکہ ان چرخوں کی شکل پرانے چرخوں سے بالکل مختلف تھی۔

چرخے سے متعلق بہت سے گیت ایسے تھے جو اکثر نوجوان لڑکیاں چرخہ چلاتے وقت گایا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک گانا جو بیحد مقبول تھا وہ کچھ اس طرح سے تھا:

چرخہ گھوم رہا مستانہ
گاندھی جی نے کاتا اس کو

نہرو جی نے مانا اس کو
ہے سرتال تالیاں اس میں
ہے سُر تال خزانہ

ہمارے گھروں میں مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تصویریں لگی ہوتیں جن میں وہ چرخہ کاتتے دکھائی دیتے چونکہ ہر بدیشی چرخہ کا بائی کاٹ کا نعرہ جنگ آزادی کا اہم حصہ بن چکا تھا، اسی لیے چرخے پر ہاتھ سے سوت کاتنے اور کھادی پہننے کی بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

حالانکہ ہمارے گھر میں اکثر اس چرخے کو لے کر کافی بحث ہوتی تھی۔ میرے والد پرنسپل چھبیل داس لاہور میں بنائے گئے مشہور نیشنل کالج کے پرنسپل رہ چکے تھے اور انقلابیوں کی ایک بڑی تعداد جس میں بھگت سنگھ اور سکھ دیو بھی شامل تھے، ان کے طالب علم رہے تھے۔ ان انقلابیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ چرخے کی کتائی ہندوستان کو آزادی نہیں دلوا سکتی، اس لیے ضروری ہے کہ انقلاب کا نعرہ لگایا جائے اور تشدد کا راستہ اختیار کیا جائے۔ اسی لیے ہمارے بابو جی اس چرخے کی کتائی کا مذاق اڑاتے تھے اور بی بی جی سے بھی کہتے تھے کہ چرخے کی کتائی کرنے کے بجائے دنیا بھر کے انقلابیوں اور انقلابیوں کی تاریخ پڑھو تاکہ یہ احساس ہو سکے کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ ہماری دادی کے

چرخہ کاتنے پر بابوجی کو اس لیے کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ وہ چرخہ محض اپنا وقت گنوانے کے لیے کاتا کرتی تھیں۔ چرخہ کاتنے کی اتنی مخالفت کے باوجود بھی ہمارے بابوجی ہمیشہ کھادی ہی کے کپڑے پہنتے تھے۔

ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم کھادی کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا پہن بھی سکتے ہیں۔ جب بھی ہمارے وہ رشتہ دار اور دوست ہمارے گھر آتے جو مل میں تیار شدہ یا ولایتی کپڑے پہنتے تو ہم انھیں حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ شاید وہ لوگ ہمارے کھادی کے کپڑوں کو بھی ان ہی نظروں سے دیکھتے ہوں کیونکہ اکثر ہماری پھوپھی، چچا اور ماموں کے بچے ہم سے یہی سوال پوچھتے تھے کہ کیا یہ موٹے موٹے کپڑے ہمیں چبھتے نہیں؟

جب دسہرہ آتا تو ہمیں لاہور کے اردو پارک میں جلائے جانے والے راون سے زیادہ دلچسپی اس دسہرے میں ہوتی جو ہم اپنے ہی ڈھنگ سے لاجپت رائے بھون میں منایا کرتے تھے۔ اس دن ہم برٹش سامراج کے پتلے بنا کر انھیں جلایا کرتے تھے۔ ان پتلوں کو بنانے کے لیے ہم سبھی بچے مہینوں تک پیسہ جمع کرتے ہماری یہی کوشش ہوتی کہ ہم ان میں زیادہ سے زیادہ پٹاخے بھریں اور ان کی بہت آواز ہو۔ ان پتلوں کو آگ لگانے سے پہلے ہم لوگ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے زوروں سے لگاتے اور آزادی

کے ڈھیروں گانے گاتے ۔ اس موقع پر لاجپت رائے بھون میں رہنے والے آس پاس کے بہت سے لوگوں کو باقاعدہ دعوت دے کر بلایا جاتا ۔ راون کی لنکا کی جگہ ہم ایک چھوٹا سا گھر بناتے جس پر انگریزی حکومت لکھا ہوتا اور اس گھر میں ہم زیادہ سے زیادہ پٹاخے بھرتے ۔

اسی طرح بہت سے بچے دوسرے دن بھی لاجپت رائے بھون میں مل کر اپنا دسہرہ مناتے ۔ ان موقعوں پر ہم چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور اسکیٹ تیار کرتے اور سبھی بچے مل کر گانے گاتے ۔ اس طرح ہم لوگوں نے ان سبھی موقعوں کو جنگ آزادی کی جدوجہد کا ایک حصہ ماننا شروع کر دیا تھا ۔

ویسے بھی پنجاب میں بیساکھی کا دن بہت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے ۔ بیساکھی ۱۳ اپریل کے دن آتی ہے ۔ اس دن کے لیے ہم لوگ نئے کپڑے سلواتے اور راوی دریا کے کنارے جانے کا پروگرام بن جاتا ۔ لاجپت رائے بھون کے بہت سے خاندان مل کر بیساکھی کے میلے کو دیکھنے جاتے ۔ صبح تین بجے سے ہی کھانا پکنا شروع ہو جاتا اور ساڑھے پانچ بجتے ہی کھانے اور پھلوں بھری ٹوکریاں اور تھیلے اٹھا کر راوی کے کنارے جانے کے لیے چل پڑتے ۔ وہاں دن بھر گزارنے کے لیے ہم اپنے ساتھ دریاں اور چٹائیاں بھی لے جاتے تھے ۔

جس طرح کا بیساکھی کا میلہ میں نے بچپن میں لاہور میں دریائے راوی کے کنارے لگتے دیکھا، ویسا پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ راوی کے کنارے ہزاروں لوگوں کی بھیڑ جمع ہوتی۔ طرح طرح کے کھانے بنانے اور بیچنے والے وہاں اپنا اسٹال لگا دیتے۔ کہیں پوری کچوری تیار ہوتی تو کہیں گرم گرم جلیبیاں مہکتیں۔ کچھ دکانیں مٹی کے کھلونوں سے سجی رہتیں۔ کسی طرف کشتیاں ہوتیں تو دوسری طرف بڑے بڑے جھولے آسمان کو چھو رہے ہوتے۔ رنگ برنگی چوڑیاں بیچنے والے بھی دکانیں سجائے بیٹھے رہتے۔ اس وقت تو یہی احساس ہوتا تھا کہ زندگی کی کوئی نعمت ایسی نہیں جو اس میں موجود نہ ہو۔

راوی دریا کے کنارے ہزاروں کی تعداد میں پڑے لکڑی کے شہتیر ہمیں بہت اچھے لگتے تھے۔ یہ شہتیر دریا میں بہہ کر آتے اور انہیں کناروں پر ٹکا دیا جاتا تھا۔ ہم شہتیروں کے بنے پہاڑوں پر دن بھر اچھل کود کرتے۔ سامنے ہی جہانگیر کا خوبصورت مقبرہ تھا۔ اس کے چار کونوں پر بنے چار مینار بہت خوبصورت دکھائی دیتے تھے۔ ہم جب بھی وہاں جاتے میناروں کے اندر بنی سیڑھیاں ضرور چڑھتے۔ مینار کی آخری منزل سے لاہور کچھ الگ سا دکھائی دیتا۔ بہت خوبصورت اور ہریالا۔

قریب ہی میں نورجہاں کا مقبرہ تھا جس کی بُری حالت تھی۔ لگتا تھا کہ تعمیر کے بعد سے اس کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں ہوئی۔ چمگادڑوں اور دوسرے پرندوں نے اسے اپنا بسیرا بنا رکھا تھا۔ سوکھے پتوں کے

ڈھیر دہاں جانے والے ہر انسان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ہم نے اکثر اپنے بابوجی سے یہ سوال پوچھا تھا کہ کیا وجہ ہے کہ جہانگیر کا مقبرہ خوبصورت حالت میں رکھا گیا ہے، لیکن ملکہ نور جہاں جس کا ہندوستان کی تاریخ میں اہم مقام ہے، کا مقبرہ اس بدحالی میں پڑا ہے۔ بہت سال بعد جب میں نے اردو کے مشہور شاعر تر لوک چند محروم کا شعر نور جہاں کے مقبرے کے بارے میں پڑھا تو میری آنکھوں کے سامنے نور جہاں کے مقبرے کا ایک ایک گوشہ گھوم گیا جہاں ہم بہت بار جا چکے تھے۔ محروم صاحب نے لکھا تھا:

دن میں بھی جہاں سیاہی کا سماں ہے
وہ مقبرۂ ملکۂ نور جہاں ہے

۱۳/اپریل کا دن ہم لوگوں کے لیے اس لیے بھی اہم ہوتا تھا کیونکہ یہ جلیاں والے باغ کی شہادت کا دن تھا۔ اسی دن ۱۹۱۹ء میں امرتسر کے جلیان والا باغ میں انگریز جنرل ڈائر نے دھڑا دھڑ گولیاں برسا کر سیکڑوں ان لوگوں کو شہید کر دیا تھا جو لاکھوں کی تعداد میں جنگ آزادی کے لیے ہوئی میٹنگ میں شامل ہوئے تھے۔ ہم جلیان والا باغ کا یہ دن یا تو ۱۲/اپریل یا ۱۴/اپریل کو منایا کرتے تھے کیونکہ ۱۳/اپریل کو تو بیساکھی کا دن تھا۔

ہمارے بابوجی جس طرح ہمیں جلیان والا باغ میں ہوئی میٹنگ کا حال سُناتے تو ہم یہی تصور کرنے لگتے کہ ہم خود اس میٹنگ میں موجود تھے۔ اس کے بعد جب کبھی بھی ہماری ملاقات جلیان والا باغ کے ہیرو ڈاکٹر سیف الدین

کچلو یا ڈاکٹر ستیہ پال سے ہوتی تو ہم ان سے ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیان والا باغ میں ہوئے حادثہ کے بارے میں ضرور پوچھتے، کیونکہ یہ دونوں لیڈر اس دن جلسے میں موجود تھے اور وہاں تقریریں بھی کی تھیں۔ کچلو صاحب جب بھی جلیان والا باغ کے جلسے کا ذکر کرتے تو جہاں ان کی آنکھیں غصے سے لال ہو جاتیں وہاں اُن میں آنسو بھی دکھائی دیتے۔ ان دنوں جلیان والا باغ کا قصہ سننا ایسا لگتا تھا جیسے ہم اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

بہت سال بعد شملہ میں مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر ستیہ پال نے گفتگو کے دوران جلیان والا باغ کا ذکر کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ جس رفتار سے ہم چل رہے ہیں بہت جلد ہم جلیان والا باغ کو ہی بھول جائیں گے۔

ڈاکٹر ستیہ پال نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اب ۱۳ اپریل کے دن بھلا کتنے ہندوستانی یہ جانتے ہیں کہ یہ دن ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ کیا جلیان والا باغ کے دن کو قربانی کے دن کی شکل میں نہیں منایا جا سکتا؟ اگر ہمارے لیڈروں نے ایسا کیا ہوتا اور ہماری نوجوان نسل کو اس بات کا احساس دلوایا جاتا کہ ملک کو آزادی انگریزوں نے کسی پلیٹ پر سجا کر پیش نہیں کی تھی، بلکہ اس کے لیے لاکھوں ہندوستانیوں کو قربانی دینی پڑی تھی، اگر ایسا ہوتا تو ہمارے ملک کی بری حالت نہ ہوتی۔

کچھ سال پہلے کی بات ہے، دلّی میں میری ملاقات ایک انجینیر

صحافی سے ہوئی ۔ جنگ آزادی کی جدوجہد پر گفتگو کرتے ہوئے میں نے انھیں جنگ آزادی کے بہت سے واقعات سنائے۔ جس میں ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کا جلیان والا باغ کا واقع بھی شامل تھا۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ کس طرح تین انقلابیوں ــــ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو لاہور جیل میں پھانسی لگا کر فیروزپور میں ستلج دریا کے کنارے ٹکڑے ٹکڑے کر کے مٹی کے تیل سے جلا دیا گیا تھا اور کس طرح اس دن پنجاب کے کسی گھر میں چولھا نہیں جلا تھا۔ میری باتیں سن کر ہمارے صحافی دوست نے یہی کہا کہ اگر دنیا کے کسی اور ملک میں جنگ آزادی کی ایسی بھرپور تاریخ ہوتی تو اسے فلموں اور ادب میں لافانی بنا دیا جاتا۔ میں اس الجیرین صحافی کے ساتھ نئی دلّی میں الجزائر کی جنگ آزادی پر بنی فلم "بیٹل آف الجیر" دیکھ رہی تھی۔ اس فلم میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح الجزائر (الجیریا) کے لوگوں نے مل کر فرانسیسی سامراج کے خلاف جدوجہد چلائی اور کس طرح قربانی دے کر آزادی حاصل کی۔ یہ فلم سچ مچ بہت اعلیٰ درجے کی تھی۔

جب اس صحافی نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس طرح کی کوئی فلم ہندوستان میں بنائی گئی ہے؟ تب مجھے ایک ہندوستانی ہوتے ہوئے اُسے یہ بتانے میں شرم محسوس ہوئی کہ آج تک کوئی اچھی فلم اس موضوع کو لے کر نہیں بنائی گئی ہے۔ شاید ہمارے فلم پروڈیوسروں کو جنگ آزادی کی کہانی اور شہیدوں کی قربانی کا موضوع دلچسپ اور دلکش نہیں لگتا۔ انھیں تو بس ایک ہی دھن ہے اور یہ کردہ ڈاکوؤں اور اسمگلروں اور کالے بازار کا

دھندلا کرنے والے سماج مخالف عناصر کو جگمگاتے ڈھنگ سے لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ آج تک ہمارے فلم بنانے والوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس طرح ہمارے نوجوانوں کے دماغوں کی پوری طرح سے دھلائی ہو چکی ہے۔

اسی موضوع کو لے کر میری گفتگو ہندوستان کے ایک مشہور فلم ڈائرکٹر اور پروڈیوسر سے بھی ہوئی جو اس بات کی دہائی دے رہے تھے کہ وہ ایسی فلمیں بنانی چاہتے ہیں جن میں مقصد ہو۔ کیونکہ وہ آزاد ہندوستان کی تعمیر میں اپنا حصہ بٹانا چاہتے ہیں۔ انھیں نے بار بار یہی کہا کہ انھیں ایسی کہانی چاہیے جس میں ایکشن ہو، بہادری کے کارنامے ہوں اور جذبات کا طوفان ہو۔

جب میں نے اسی فلم ڈائرکٹر سے یہ سوال پوچھا کہ کیا انھیں ہندوستان کی جنگ آزادی میں غدر پارٹی کے بہادروں کی داستان متاثر نہیں کرتی؟ کیا انھیں اس واقعے میں ایکشن دکھائی نہیں دیتا کہ کس طرح ہاتھوں اور پیروں میں ہتھکڑیوں اور بیڑیوں سے جکڑے ہوئے آزادی کے دیوانے برٹش قید سے آزاد ہونے کے لیے گہرے سمندر میں چھلانگ لگا دیتے تھے اور سیکڑوں میل تیرتے ہوئے چلے جاتے تھے؟ کیا انھیں اس کہانی میں جذبات نظر نہیں آتے کہ ایک نوجوان جیل میں جاتا ہے اور پورے ۲۳ سال کی سزا کاٹ کر جب باہر آتا ہے تو اس کی داڑھی سفید ہو چکی ہوتی ہے لیکن اس میں جنگ آزادی کے لیے مر مٹنے کا جذبہ اسی طرح جوان رہتا ہے؟ کیا انھیں یہ کہانی بھی متاثر نہیں کرتی کہ تین نوجوان پھانسی کے تختے پر قربانی کے لیے تیار کھڑے ہیں۔ پھانسی سے پہلے ایک نوجوان کی ماں ان سے ملنے آتی ہے اور یہی کہتی ہے

کہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت ماں بھلا اس دنیا میں کون ہوگی جس کا بیٹا بھارت ماں کے لیے قربانی دینے جارہا ہے۔ یہی ماں اپنے بیٹے کو کہتی ہے کہ تم آج دولہا بنے آزادی کی دلہن کو بیاہنے جارہے ہو، میں بہت خوش ہوں؟

میرے ان سوالوں کا جواب وہ فلم ساز نہ دے سکے اور خاموش ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمام کہانیاں فلموں کی شکل میں باکس آفس ہٹ ثابت ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ ہمارے نامی فلم بنانے والے ان فلموں کو بنائیں اور بڑے اداکار ان میں کام کریں۔ آج تک یہی ہوا ہے کہ ان فلموں کو تیسرے درجے کی گھٹیا چھوٹے بجٹ کی فلم بنا کر تیار کیا گیا اور پھر یہ کہا گیا کہ یہ فلمیں گھاٹے کا سودا ثابت ہوئی ہیں۔

جس طرح شعلے فلم میں ڈاکو گبر سنگھ کا کردار بڑی شان اور پبلسٹی سے پیش کیا گیا اور جس طرح دیوار کے ہیرو اسمگلر راجو کا کردار پیش کیا گیا کہ بٹن دباتے ہی اسے زندگی کی ہر نعمت مل جاتی تھی، اگر اسی طرح شہید بھگت سنگھ کا کردار کسی فلم میں پیش کیا جاتا تو وہ بھی عوام میں اسی طرح مقبول ہوتا۔ ڈاکوؤں کو ہیرو بنانے کے بجائے اگر سچ مچ جنگ آزادی کے ہیرو کو ہیرو بنا کر پیش کیا جائے تو کتنا اچھا ہو۔ انگریزوں نے ایک مرتبہ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی دی تھی لیکن پچھلے ۳۷ سالوں میں آزاد ہندوستان میں بار بار ڈاکو گبر سنگھ اور اسمگلر راجو، شہید بھگت سنگھ اور سکھ دیو کا گلا گھونٹتے رہے ہیں۔

میرا جیل کا سفر

بی بی جی اور بابو جی کو جیل گئے دس مہینے گزر چکے تھے۔ ہم روز کی طرح گول باغ کی سیر کرنے کے بعد جب ایک دن شام کو گھر لوٹے تو نانی جی نے ہنستے ہوئے پوچھا "کیا تم ماں کے پاس جیل جاؤ گی؟" ویسے تو ہم لاجپت رائے بھون میں بی بی جی اور بابو جی کے جیل جانے کے بعد بھی بہت خوش تھے، لیکن ماں کے پاس رہنے کی بات سنتے ہی میں خوشی سے اچھل پڑی۔

نانی جی نے بتایا کہ اسی شام پولیس انسپکٹر آکر بتا گیا تھا کہ دو چھوٹے بچے ماں کے پاس جیل میں جاکر رہ سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی میری بہن سنتوش پریشان ہو گئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جب محض دو بچے جائیں گے تو وہ دو، میں اور ہمارا چھوٹا بھائی اشوک ہی ہوں گے۔ وہ رونے لگی لیکن مجھے اپنی ماں کے پاس جانے سے زیادہ شوق جیل کو اندر سے دیکھنے کا تھا اور جیل میں رہنے کا تھا۔ میں اتنی خوش تھی کہ میں نے ایک بار بھی سنتوش سے

نہیں کہا کہ میں گھر پر رہوں گی، تم اشوک کے ساتھ جیل چلی جاؤ۔

اگلے دو دن جیل جانے کی تیاری میں گزرے۔ ہمارے گھر میں ایک عجب ماحول تھا۔ سنتوش روتی بھی جاتی اور میرے اور اشوک کے کپڑے تیار کرنے میں مدد بھی کرتی جاتی۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ہم کتنے عرصے جیل میں رہیں گے۔ کچھ دن۔ کچھ مہینے یا کچھ سال۔ لیکن ہماری نانی جی تھیں جو صرف اس تیاری میں لگی تھیں کہ کھانے کی کیا کیا چیزیں ہمارے ساتھ بھیجی جائیں۔ چونکہ ہماری بی بی جی، نانی جی کی سب سے لاڈلی بیٹی تھیں اس لیے وہ یہی چاہتی تھیں کہ زیادہ سے زیادہ چیزیں بنوا کر ہمارے ساتھ جیل بھیجی جائیں۔

لاجپت رائے بھون میں سے لالہ اچنت رام جی کی بیٹی نمی جس کا پورا نام نرمل تھا، وہ بھی جیل جا رہی تھی کیونکہ اس کی ماں یعنی ہماری ستیہ وتی چچی بھی جیل میں تھیں۔ ہم لوگ اتنے خوش تھے کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا اپنے ساتھ لے جائیں۔ حالانکہ سنتوش مجھ سے صرف ڈیڑھ سال بڑی تھی لیکن اس نے بڑی بہن ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بہت فراخ دلی دکھائی اور مجھ سے کہا کہ میں سبھی اچھے کپڑے اور من پسند کھلونے اپنے ساتھ لے جاؤں۔ سنتوش اور میرے کپڑے مشترکہ ہی تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے سب سے پہلے اپنے بکس میں مٹی کے کھلونے رکھے۔ بعد میں ہم سب بچے جیل میں کھلونوں سے کھیلتے رہے۔ تیاری کے وہ دن ہمیں دس مہینوں سے بھی زیادہ لمبے محسوس ہوئے جو ہم نے اپنی ماں کے بغیر گزارے تھے۔

ساری رات نیند نہیں آئی۔ اسی بات کی بے چینی تھی کہ کب صبح ہو اور

کب ہم جیل روانہ ہوں۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں۔ تانگہ بلایا گیا جس میں ہماری نانی جی، ممّی کی بڑی بہن سبھدرا، ہنی، سنتوش اور میں بیٹھ کر جیل کی جانب روانہ ہوئے۔ سنتوش راستے بھر روتی رہی کیونکہ وہ بالکل اکیلی رہ جانے والی تھی۔ میں اسے تسلّی دے رہی تھی کہ جیل سے جلدی واپس آجاؤں گی۔ کیونکہ ہم قیدی تو نہیں تھے کہ انگریز سرکار کی مرضی کے مطابق جیل میں رہیں۔ جب دل چاہے واپس آسکتے ہیں۔ اپنے چچا کے دیے ہوئے چھ روپے بھی سنتوش کو دے دیے۔

ہمارے گھر سے لاہور سنٹرل جیل کوئی آٹھ دس میل دور ہو گا، لیکن اس دن تو راستہ ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اشوک گم سم تانگہ میں بیٹھا تھا۔ لگتا تھا اسے جیل جانے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔ نانی جی بار بار ہمیں یہ ہدایت دیتیں کہ ہم جیل میں اپنی ماں کو تنگ نہ کریں اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دیتیں کہ اگر کوئی ہماری شکایت ملی تو وہ فوراً واپس لے آئیں گی۔

جب ہم جیل کے دروازے پر پہنچے تو ہمارا سامان اتار کر ایک طرف رکھ دیا گیا اور ہم جیل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں گئے اور وہاں ہمارا پورا نام پتہ لکھا گیا اور ہمارے سامان کی پوری تلاشی لی گئی۔ تلاشی لینے والے جیل ملازمین نے ہمارے کھادی کے کپڑوں کو بہت حقارت سے دیکھا اور انھیں نکال کر باہر پھینکنے لگے۔ اس پر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے ان سے کہا، "تم بھی ٹوڈی بچے ہو جو کھادی کے کپڑوں کو اس طرح پھینک رہے ہو۔" کپڑوں کے بعد اس نے ہمارے کھلونوں کو دیکھا۔

انھیں اس طرح سے الٹ پلٹ کر جانچنے لگا جیسے ہم ان کے اندر کوئی خوفناک چیزیں ڈال کر لے جا رہے ہوں۔ ہم بچوں کا جی تو چاہا کر اس تلاشی لینے والے کی اچھی مرمت کر دیں لیکن یہ سوچ کر خاموش رہ گئے کہ کہیں اس سے بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے اور ہمیں جیل کے اندر داخلے کی اجازت ہی نہ ملے۔

ایسا لگتا تھا کہ ہماری نانی جی مجھے اور اشوک کو کسی بورڈنگ ہاؤس میں بھرتی کروانے آئی ہیں۔ طرح طرح کے فارم بھرے گئے اس سارے کام میں ڈیڑھ گھنٹہ بیت گیا۔ ہم پریشان تھے کہ نہ جانے اور کتنا وقت لگے گا۔

اس دن ملاقات کا دن نہیں تھا اس لیے بی بی جی باہر نہیں آئیں۔ ہمارا سامان جیل کے ایک مزدور نے اٹھا لیا اور ہم تینوں بچوں نے نانی جی، سنتوش اور سبھدرا ہمن جی سے گلے مل کر جیل کے بڑے پھاٹک کے اندر قدم بڑھا دیے۔ میں نے گھوم کر دیکھا کہ سنتوش رو رہی تھی اور ہاتھ ہلا رہی تھی۔ جیل کا پھاٹک بند ہو گیا۔

مضبوط دیواروں کے پیچھے

لیکن جیل کے اندر کی دنیا ویسی نہیں تھی جیسا کہ ہم نے سوچا تھا۔ ایک بڑا سا میدان تھا جگہ جگہ کچھ پیڑ بھی لگے ہوئے تھے اسی میدان کے ایک کونے میں ایک لمبا بیرک نما گھر تھا۔ جیل میں سبھی کو پتہ چل گیا تھا کہ بچے آ گئے ہیں اسی لیے بی بی جی ہمیں راستے میں مل گئیں۔ ہم خوشی سے ان سے

لپٹ گئے اور گھر کے سارے حالات بتانے لگے نہ جانے کیوں اشوک مجھ سے چھوٹا ہوتے ہوئے بھی جیل کے اندر آکر خوش نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ اس لیے بی بی جی سے ملتے ہی کہنے لگا۔" آپ نے ہمیں کیوں بلایا ہے؟"

بی بی جی کے ساتھ ہی ستیہ وتی پھچی کھڑی تھیں۔ ان کی بیٹی نرمل ہمارے ساتھ آئی تھی انھوں نے پہلے مجھے اشوک کو گلے لگایا اور بعد میں اپنی بیٹی نرمل کو۔ ہمیں اسی وقت یہ احساس ہوا کہ ہم سب ایک ہی خاندان کا حصہ ہیں۔ کیونکہ نرمل بی بی جی کی گود میں جا بیٹھی تھی۔

ہمیں اپنی ماں کا یہ نیا گھر عجیب لیکن اچھا لگا۔ اسی بیرک میں جو سیاسی قیدیوں کے لیے رکھی گئی تھی، چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہماری بی بی جی کے پاس ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جسے انھوں نے بہت خوبصورتی سے سجا رکھا تھا۔ پیلی کھادی کی ساڑی کے پردے لگا رکھے تھے ایک طرف تخت بچھا تھا اور دوسری طرف چٹائی۔

کچھ ہی دیر میں وہاں بہت سی عورتیں جمع ہو گئیں۔ ان میں سے کوئی بھی چہرہ ہمارے لیے ناواقف نہیں تھا۔ یہ سب وہی تھیں جنھیں ہم خالہ یا پھچی کہتے تھے اور میٹنگوں کے لیے لاجپت رائے ہال یا بریڈلا ہال میں جمع ہوا کرتی تھیں اور اکثر ہمارے گھر بھی آیا کرتی تھیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ ہم نانی جی اور اپنی دو بہنوں کو چھوڑ کر ایک بہت بڑے گھر میں آگئے ہیں۔ مجھے کسی بھی عورت کے چہرے پر غم یا پریشانی کی شکن دکھائی نہیں دی۔ صحت بھی ٹھیک لگتی تھی

جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جیل میں ناخوش نہیں ہیں۔

اشوک اور نمّی تھوڑی دیر بعد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھیلنے چلے گئے۔ میں جیل کے دوسرے حصوں کو دیکھنا چاہتی تھی، لیکن اس وقت دھوپ بہت تیز تھی۔ لاہور میں جون کا مہینہ سخت گرمی کا ہوتا ہے۔ ہم جیل کے اندر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے پہنچے تھے۔ سبھی سے ملتے ملاتے ساڑھے بارہ بج گئے۔ بی بی جی نے کہا: "اب تو تمہیں یہیں رہنا ہے، آرام سے ساری جیل دیکھتی رہنا۔"

بی بی جی کے کمرے میں ایک چھوٹا سا ٹیبل فین بھی لگا تھا۔ وہ مجھ سے گھر کی ساری باتیں پوچھتی رہیں کہ نانی جی کا کیا حال ہے۔ ان کے پیچھے گھر میں کون کون آتا رہا؟ بابو جی جیل سے خطوں میں کیا لکھتے رہے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں نے بی بی جی کو بتایا کہ سنتوش بہت رو رہی تھی تو وہ بھی اداس ہو گئیں۔

سیاسی قیدیوں کو کھانا بنانے کے لیے مدد دی گئی تھی۔ جیل کی قیدی عورتیں آتیں۔ وہ ان کا کھانا بھی بناتیں، صفائی بھی کرتیں اور کپڑے بھی دھوتیں۔ ان قیدی عورتوں کو مشقّتی کہا جاتا تھا۔ کھانے کے لیے دال، سیتا پھل کی سبزی اور دہی تھا۔ اشوک کو سیتا پھل کی سبزی سے بڑی چڑ تھی۔ وہ اپنی عادت کے مطابق منہ بنا کر کہنے لگا "یہ سبزی کیوں بنائی ہے آپ کو پتہ ہے کہ میں یہ سبزی نہیں کھاتا۔" یہ سن کر ستیہ وتی چچی (مسز کامریڈ رام کشن) پیار سے بولیں "بیٹا یہ تو جیل ہے، گھر نہیں۔ یہاں تو ہر روز یہی سبزی ملے گی۔ جیل والے اس سیتا پھل کو کرموں کے پھل کہتے ہیں۔"

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ جیل میں سیتا پھل اور لوکی کے علاوہ اور کوئی تیسری سبزی نہ تھی کیونکہ یہی سبزیاں بڑے پیمانے پر جیل ہی کے اندر اگائی جاتی تھیں۔ مجھے اور اشوک کو پریشانی ہوئی کہ اب ہمیں ہر روز سیتا پھل کھانا پڑے گا یا لوکی۔ اس دن بی بی جی نے اپنے حصے کے دودھ کی کھیر پکائی تھی۔

جیل میں ایک مشقتن چار سیاسی قیدیوں کا کام کرتی تھی۔ ان سیاسی قیدیوں کو کچا راشن ہر ہفتے ملتا تھا جس میں آٹا چاول دالیں اور گھی ہوتا تھا۔ سبزیاں اور دودھ بھی روزانہ ملتا تھا۔ حالانکہ تمام سیاسی قیدیوں کی بیرک میں بنے اپنے اپنے کمروں میں کھانا تیار ہوتا تھا لیکن کھانے کے وقت سبھی ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے اور ایک کمرے میں دری بچھا کر سبھی اس پر بیٹھتے اور الگ الگ پکا ہوا کھانا ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا جاتا۔ چونکہ جیل میں سبزیاں دو ہی تھیں ایک لوکی اور دوسری سیتا پھل، اس لیے میں نے پہلی مرتبہ الگ الگ طریقے سے پکی انہی سبزیوں کو ایک ساتھ کھایا۔ ستیہ وتی چاچی جی اکثر ہنستے ہوئے کہتی تھیں کہ جیل سے باہر نکلنے پر ہم سبھی سیاسی قیدی لوکی اور سیتا پھل کی طرح طرح کی چیزیں بنانے میں ماہر ہو جائیں گے۔

میں نے جیل میں کسی بھی عورت کے چہرے پر پریشانی اور مایوسی کو نہیں دیکھا۔ ان کے چہرے ہر وقت خوشی سے کھلے رہتے اور شام کے چھ بجتے ہی وہاں پر ہلچل شروع ہو جاتی اور سبھی عورتیں تیار ہو کر بیرک کے سامنے بنے کھلے میدان میں عبادت کے لیے جمع ہو جاتیں۔ ہر روز کوئی

نہ کوئی عورت تقریر کرتی۔ تقریر کا موضوع "جنگ آزادی" ہی کا کوئی پہلو رہتا۔ تقریر کی باقاعدہ تیاری کی جاتی تھی۔ اکثر ان تقریروں میں اسی بات پر زور دیا جاتا تھا کہ جنگ آزادی میں عورتیں کس طرح سے اپنا حصہ بٹا سکتی ہیں اور ان کا تعاون کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ ان میٹنگوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اس سے تمام سیاسی قیدیوں کا حوصلہ اور جوش برقرار رہتا اور انہیں ہر وقت یہی احساس رہتا کہ وہ ایک اہم مقصد کو لے کر جیل میں آئی ہیں۔

ہر روز صبح ساڑھے چار بجے سے ساڑھے پانچ بجے تک پربھات پھیری ہوتی۔ عورتیں جلوس کی شکل میں جیل کی چہار دیواری کا چکر کاٹتیں، آزادی کے ترانے گاتیں اور نعرے لگاتیں۔ اس وقت بھی ان میں وہی جذبہ دکھائی دیتا جیسا کہ جیل سے باہر کی سیاسی سرگرمیوں میں دکھائی دیتا تھا۔ پربھات پھیری میں شامل ہونے کے لیے سبھی عورتیں نہا کر صاف کپڑے پہنتیں۔ چھوٹے بچے اکثر سوتے رہتے اور جب ان کی مائیں واپس بیرک میں آتیں تو وہ اٹھ کھڑے ہوتے۔ میں بھی کئی بار اس پربھات پھیری میں شامل ہوئی تھی۔

جس طرح ڈسپلن میں نے جیل میں ان کانگریسی کارکنوں میں دیکھا ویسا کبھی بھی دکھائی نہیں دیا۔ پربھات پھیری ختم کرنے کے بعد سبھی عورتیں ناشتہ کرتیں، کمروں کی صفائی ہوتی۔ بیرک کا تقریباً ہر کمرہ بہت ہی اچھے ڈھنگ سے سجا کر رکھا گیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں رہنے والی تمام عورتوں میں یہ مقابلہ رہتا ہے کہ کس کا کمرہ زیادہ سجا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی تھی کہ جنگ آزادی میں لڑنے والی یہ بہادر عورتیں کتنا حسین اور نازک

دل رکھتی تھیں۔

صبح آٹھ بجے سے وہاں باقاعدہ کلاسیں لگتیں۔ آٹھ سے دس بجے تک انگریزی کی کلاس ہوتی۔ جو عورتیں انگریزی نہیں جانتی تھیں وہ انگریزی لکھنا، پڑھنا اور بولنا سیکھتیں کیونکہ پڑھنے اور پڑھانے والے دونوں کو اس بات کا پورا احساس تھا کہ انگریزوں کے ساتھ جدوجہد کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کو انگریزی کا علم ہو۔ دشمن کا مقابلہ اُسی کے ہتھیار سے ہو تو وہ زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ اکثر عورتوں نے جیل میں رہ کر انگریزی پڑھنا، لکھنا اور بولنا سیکھا تھا۔

اس کے علاوہ سیاسی تعلیم کی کلاس بھی ہوتی۔ سبھی عورتیں سیاسی بحث میں حصہ لیتیں اور گاندھی جی کی اہنسا کی فلاسفی پر بحث ہوتی۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے تشدد اور عدم تشدد دونوں ہتھیاروں کے استعمال کرنے پر بحث ہوتی تھی۔ کوئی بھی عورت ایسی نہیں تھی جو بحث میں حصہ نہ لیتی ہو۔ آج خیال آتا ہے کہ تحریکِ آزادی کے ان دنوں میں جب کارروائی یعنی ایکشن ہی سب کچھ تھا تب سیاسی فلاسفی پر خوب بحث ہوتی تھی، لیکن آج کانگریس کے کارکن کانگریس کے بنیادی اصولوں سے بھی واقفیت نہیں رکھتے۔

ہم بچے بھی ان کلاسوں میں بیٹھتے۔ حالانکہ ان کی اکثر باتیں ہماری سمجھ سے باہر ہوتی تھیں۔ ان بچوں میں، میں سب سے بڑی تھی۔ چھوٹے بچوں میں مرحوم لالہ اچنت رام جی کی بیٹی رنجی، مسز ساوتری رام دیوی جی کے

دو بچے منا جس کا نام بھی منور ما تھا، اُس کا چھوٹا بھائی وِجے اور میرا چھوٹا بھائی اشوک تھے۔ ہم سبھی بچے کچھ ہی دنوں میں جیل کی بہت سی باتوں سے واقف ہو گئے۔ ہمیں پتہ چل گیا تھا کہ لاہور ویمن سینٹرل جیل میں سیاسی قیدیوں کے علاوہ اور دوسری بہت سی عورتیں بھی قید کاٹ رہی تھیں۔ ان میں سے بہت سی عورتیں ایسی تھیں جو خون اور چوری کے الزام میں گرفتار ہوئی تھیں۔ ہم کئی بار کھیلتے ہوئے پھانسی کی کوٹھری کی جانب چلے جاتے۔ مجھے ہمیشہ یہ جاننے کی خواہش رہتی کہ جو عورتیں ان پھانسی کی کوٹھریوں میں بند ہیں، وہ کیسی ہوتی ہیں۔ آج بھی ان میں سے بہت سی عورتوں کی ویران آنکھیں، جنھیں میں ہر روز پھانسی کی کوٹھری کی سمت میں سے دیکھا کرتی تھی میری آنکھوں کے سامنے گھوما کرتی ہیں۔

جیل کی بہت سی ایسی قیدی عورتیں ہم بچوں کی دوست بن گئی تھیں۔ وہ اکثر ہم سے پوچھا کرتیں کہ ہمارے گھر میں اور کون لوگ ہیں۔ بلونت کور، جس کا قد کم سے کم پانچ فٹ سات انچ ہوگا اور جو کالی بھجنگ تھی اور جس کی عمر چالیس سال کی رہی ہوگی، مجھے بہت پیار کرتی تھی اور جب بھی ملتی یہی سوال پوچھتی کہ میری ماں اور اُن کے ساتھ آئی ہوئی دوسری عورتیں سیاسی جلسے اور جلوسوں میں حصہ لیتی رہی ہیں، تقریریں کرتی ہیں اور نعرے لگاتی ہیں تاکہ انگریز ہندوستان چھوڑ دیں اور ملک کو آزادی مل جائے، تو بلونت کور کھلکھلا کر ہنستی اور کہتی " میں تو کسی کو قتل کر کے عمر قید بھگت رہی ہوں لیکن تمہاری ماں محض نعرے لگانے اور انگریزوں کو

ہندوستان چھوڑنے کے لیے تقریر کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے۔"
بلونت کور کا یہ کہنا بھی تھا کہ وہ تو یہ جانتی ہے کہ وہ کتنے سال کے لیے جیل میں
بند ہے اور جو دن گزرتا ہے وہ اس کی قید میں سے کٹ جاتا ہے۔ لیکن
میری ماں اور دوسری عورتیں تو یہ نہیں جانتیں کہ انھیں جیل میں کتنی دیر رہنا ہوگا۔
بلونت کور کی سہیلی سُکھ بیر کور جو اسی کی طرح عمر قید بھگت رہی تھی، اکثر ہم سے
پوچھتی "اگر انگریز سو سال تک ہندوستان سے نہیں گئے تو کیا یہ ساری
عورتیں تب تک جیل میں پڑی رہیں گی ؟" انھیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ محض پانچ
سال بعد ہی ۱۹۴۷ء میں انگریز ہندوستان چھوڑ دیں گے اور ملک آزاد
ہو جائے گا۔

پیاری کی پیش گوئی

ابھی تک میرے کانوں میں ہر وقت ہنستے رہنے والی خوش مزاج،
چھوٹے سے قد کی قیدی 'پیاری' کے یہ الفاظ گونجتے ہیں " بچے تم
دیکھ لینا یہ انگریز کبھی ہندوستان سے نہیں جائیں گے یہ ہمیشہ ہمارے
سر پر سوار رہیں گے۔" پیاری جس کا پورا نام رام پیاری تھا، بار بار مجھ سے
کہتی کہ میں جا کر اپنی ماں سے کہوں کہ وہ جیل میں اپنی زندگی برباد نہ کرے۔ میں
جب کبھی جا کر بی جی اور دوسری سیاسی قیدیوں سے یہ بات کہتی تو
سب کھلکھلا کر ہنستیں اور پیاری کو اپنا پیار بھیجتیں۔ جب میں پیاری
سے ملتی تو وہ مجھ سے پوچھتی کہ میری ماں نے اس کے سوال کا کیا جواب
دیا ؟

پیاری سچ ہی کہتی تھی کہ یہ انگریز ہندوستان کو کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ ہم ان کی غلامی سے کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتے۔ آج سے ۳۷ سال پہلے ہم آزاد ہوئے تھے لیکن ہم انگریزی ذہنیت اور تہذیب کی ذہنی غلامی میں پہلے سے کہیں زیادہ جکڑے جا رہے ہیں۔ آج بھی ہمارے حکمراں ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد نہیں کر پا رہے ہیں۔ آج بھی انگلینڈ ہمارے لیے ایک مقدّس جگہ ہے۔ آج بھی انگلینڈ میں ہندوستانیوں کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔ آج بھی انھیں گوروں کے ہاتھوں مار کھانی پڑتی ہے۔ آج بھی ہندوستانی بچیوں کو "برٹش ایرپورٹوں" پر اپنے کنوارے پن کا میڈیکل ٹیسٹ کروانا پڑتا ہے۔ آج بھی دوسرے ایشیائیوں کے ساتھ ہندوستانیوں کے گھر اور دکانیں انگلینڈ میں جلائی جاتی ہیں۔

لیکن دوسری جانب ہم ہندوستانی ماؤنٹ بیٹن جیسے انسان کی موت پر سات دن کا سوگ مناتے ہیں۔ وہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن جسے ہم ہندوستانیوں نے آزاد ہو جانے کے بعد بھی اپنا پہلا گورنر جنرل بنایا تھا، اس نے ہر ہندوستانی لیڈر کے متعلق بری باتیں کہی تھیں، اس نے یہ تک کہا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم میں اگر دو کروڑ انسان بھاجر بن بھی جاتے ہیں تو کوئی بڑی بات نہیں ہے، اسی ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کو تقسیم کر کے اسے فرقہ وارانہ فسادات کے خونی دریا میں ڈبو دیا۔ آج اسی لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر ایک فلم بن رہی ہے اور ہمارے صدر جمہوریہ

فلم یونٹ کے عیش و آرام کا سارا بندوبست اپنے ہاتھوں سے کرنے میں مصروف ہیں۔

برٹش غلامی کی یہ زنجیریں ہمارے گرد پھیلتی ہوئی ہمیں جکڑ رہی ہیں۔ ہندوستان کو من ویلتھ کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، جب کہ اسے وہاں رہنے میں نقصان ہی ہے۔ ہم ابھی تک برٹش سامراج کو بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے صدر جمہوریہ سنجیوا ریڈی نے اس بات کی بھی پروا نہ کی کہ برطانیہ میں ہندوستانیوں کو مارا جا رہا تھا اور وہ وہاں کے ولی عہد پرنس چارلس کی شادی میں شامل ہونے کے لیے لندن پہنچ گئے۔ وہاں نہ ان کی کسی نے عزت کی، نہ بات پوچھی وہ اکیلے پانچویں قطار میں بیٹھے رہے۔ ان کے مقابلے میں یورپ کے گھٹیا ترین چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو پہلی قطار میں بٹھایا گیا مجھے یقین ہے کہ اگر جیل والی پیاری آج زندہ ہوگی تو وہ کہیں نہ کہیں بیٹھی اپنے نانی پوتوں کو ضرور لاہور جیل کے ان سیاسی قیدیوں کی داستان سنا رہی ہوگی۔

متا اور میں گھنٹوں جیل کے پھاٹک پر بیٹھے چوکیدار سنت رام سے باتیں کرتے رہتے۔ وہ ہم سے پوچھتا کہ ہماری ماں جیل کیوں آئی ہیں تو متا تنک کر کہتی " تم جیسے انگریزوں کے پٹھوؤں کو مارنے کے لیے " متا اور میں بیٹھ کر یہی اسکیم بنایا کرتے کہ اگر چوکیدار سنت رام نے ہم سے پھر کوئی ایسا سوال پوچھا تو ہمارا جواب کیا ہوگا۔ اس وقت ہم چھوٹے بچوں کو یہ احساس نہیں تھا کہ بیچارا سنت رام ٹوڈی نہیں ہے۔ وہ تو اپنے چھ بچوں اور اپنے کنبے کے دوسرے افراد کا پیٹ پالنے کے لیے جیل میں نوکری کر رہا ہے۔

جیل میں سیاسی قیدی عورتیں سارا دن کوئی نہ کوئی کام کرتی ہی رہتی تھیں ۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کر کے چرخے کی کلاس شروع ہو جاتی ۔ ہر روز یہی مقابلہ ہوتا کہ سب سے باریک اور زیادہ سوت کون کاتتا ہے ۔ ان عورتوں کا جو بھی سامان باہر سے آتا، اس میں روئی کی پونیوں کے بہت سے بنڈل ضرور ہوتے ۔ جب بھی پونیوں کے بنڈل آتے، جیل کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال ہنس کر کہتی تم روئی کاتتی جاؤ، دیکھتے ہیں سوت سے آزادی کیسے ملے گی ۔ اُسی کو چڑانے کے لیے جب بھی روئی کی پونیوں کے بنڈل آتے، سیاسی قیدی عورتیں اونچی آواز میں آزادی کے ترانے شروع کر دیتیں ایک ترانہ جو ہر روز گایا جاتا تھا اس کے بول یوں تھے ۔

اُسی تیرا کہنا مانا اُو گاندھیا
اُسی تیرے پیچھے چلنا او گاندھیا
بجھا ر دِ کیندی برنی
سانو لیندے نئی جیئ چرکھی
نال آجادی دیاں پونیاں او گاندھیا

ایک دن ہم سب بچے صبح کے وقت بیٹھے زمین پر دائرے بناتے ہوئے باتیں کر رہے تھے ۔ نرمل کی یہ عادت تھی کہ وہ باتیں کرتے کرتے سیکڑوں دائرے بنا دیتی تھی ۔ اُسی سے ہم نے یہ عادت سیکھی تھی ۔ باتیں جیل میں رہنے کی ہو رہی تھیں ۔ متا نے کہا وہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے جیل

بالکل بھی اچھی نہیں لگتی۔ اگر میری ماں یہاں نہ ہوں تو میں یہاں کبھی نہ رہوں۔"
یہ سُن کر منّا کا چھوٹا بھائی بڑبڑ بولا۔ "تم انگریزوں کی پٹھو بن گئی ہو۔ اگر تمھیں
کل جیل آنا پڑے تو تم ضرور معافی مانگ کر واپس چلی جاؤگی۔" اس پر منّا
تنک کر کہتی، "جب تک ہم بڑے ہوں گے اور جیل جانے کے لائق
ہوں گے تب تک کیا ہندوستان کو آزادی نہیں ملے گی؟" اس وقت
ہم چھوٹے بچے جس سنجیدگی سے ملک کی آزادی کے متعلق بات چیت کرتے
اسے سوچ کر آج ہمیں خود تعجب ہوتا ہے۔ ہم بچوں کو انگریزوں اور ان کے
پٹھو ٹوڈیوں سے بے حد نفرت تھی۔ ہم جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر سوداگر سنگھ
اور اس کے پورے خاندان کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

جیل سپرنٹنڈنٹ جب قیمتی جارجٹ کی ساڑیاں پہن کر آتی تو ہم اسے دیکھ
کر یہی کہتے "یہ ولایتی کپڑے انگریزوں نے انھیں کانگریسیوں پر ظلم ڈھانے
کے لیے انعام میں انگلینڈ سے بھیجے ہیں"۔ کبھی کبھی مسٹر سوداگر سنگھ کی چھوٹی
بیٹی بھی اپنی ماں کے ساتھ جیل کے اندر آتی۔ اس کے قیمتی بدیسی کپڑوں کو ہم
حسرت سے نہیں، بلکہ نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ایک دن بے بی ہمیں منہ چڑا کر کہنے لگی "تمہارے کھدر کے کپڑے
کتنے گندے ہیں۔ تمہاری ممی اتنی موٹی ساڑی پہنتی ہیں بالکل ہماری نوکرانی جیسی"
ہمارے جی میں تو آیا کہ پکڑ کر بے بی کی خوب مرمّت کریں، لیکن وہ جیل چیف کیدار
سنت رام کے پاس کھڑی تھی، اس لیے بھی ہم اس کی پٹائی نہیں کر سکے۔
ہم اس پر بہت بگڑے اور چلّا چلّا کر کہنے لگے "تم لوگ غدّار ہو" ہمارے

ہی سامنے بے بی نے اپنی ممی سے پوچھا تھا " ممی یہ غدار کیا ہوتا ہے" سپرنٹنڈنٹ صاحبہ نے منہ نیچا کر کے ہنستے ہوئے کہا تھا " بے بی تم ان گندے بچوں سے باتیں مت کرو۔ یہ سب پاگل ہیں، ان کے ماں باپ بھی پاگل ہیں "

ہم ہر روز شام کو بیٹھ کر یہی اسکیم بناتے کہ کل بے بی آئے گی تو ہم کیا کہہ کر اسے پریشان کریں گے ۔ رونجے کہتا " اس کی انگریزی فراک اتروا دو اور اسے کھدر کی فراک پہنا دو" منّا چلّا کر کہتی " نہیں نہیں میں اسے اپنی فراک پہننے کے لیے کبھی نہیں دوں گی ۔ وہ ٹوڈی کی ہے ۔" کبھی کبھی ہم بھی یہ سوچتے کہ کیوں نہ مل کر ہم بے بی کی پٹائی کریں ۔ لیکن بے بی پھر اپنی ماں کے ساتھ جیل کے اندر نہیں آئی ۔

ہم چوکیدار سے پوچھتے رہے کہ بے بی کیوں نہیں آتی ۔ سنت رام ہمیں بتاتا کہ بے بی ڈپٹی صاحب یعنی مردوں کے جیل سپرنٹنڈنٹ کے بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتی ہے ۔ وہ آپس میں انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں ۔ بے بی کا جیل کے اندر نہ آنا ہم نے اپنی فتح سمجھی ۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ جیل کے اندر آئے ہم اس کی بے عزتی کریں گے اور اسے نیچا دکھائیں گے ۔ ممی اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا اس کے بال اور دانت بھی ولایت سے آئے ہیں ۔

ایک نئے طوفان کی آمد

ہم نے دیکھا کہ ہماری بیرک کی عورتوں میں ایک خاص قسم کی ہلچل اور سرگرمی پیدا ہو رہی ہے۔ ہر وقت ہماری ماں اور دوسری عورتیں کچھ نہ کچھ سینے میں لگی رہتی تھیں۔ رات بارہ بجے تک بند کمرے میں میٹنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ہمیں نیند آنے لگتی تو ہم ان میٹنگوں کے بارے میں سوچتے بی بی جی کی گود میں سو جاتے تھے۔ ہمیں اتنا ضرور پتہ تھا کہ بہت جلد کوئی بڑی بات ہونے والی ہے، کوئی طوفان آنے والا ہے۔

رات کے وقت جب تمام عورتیں کھلے میدان میں جمع ہوتیں، تو اونچی آوازیں میں یہی نعرے بلند ہوتے "۸ راگست کو کیا ہوگا۔ جیلوں میں انقلاب" آٹھ اگست کو "انگریز ہندوستان چھوڑو" کی مہم کو ایک سال ہونے والا تھا۔ یہ نعرہ ۸ راگست ۱۹۴۲ء کو لگایا گیا تھا۔ عورتیں بہت بلند آوازیں نعرے لگاتیں اور پھر مردوں کی جیل سے آنے والے جوابی نعروں کو سننے کی کوشش کرتیں۔ حالانکہ دونوں جیلوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا لیکن جس

بلندی سے یہ نعرے لگائے جاتے وہ مردوں کی جیل میں اچھی طرح سے سنائی دیتے اور اس کے جواب میں جو نعرے وہاں لگتے وہ ہم لوگوں کو بھی سنائی دیتے تھے۔ یہ روز کا قاعدہ بن چکا تھا۔ ہم بچے بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتے تھے ہر روز ہم ایک دوسرے سے یہی کہتے کہ ہماری آواز اُن سے زیادہ بلند ہے۔

ہم بے صبری سے ۸ر اگست کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر روز گنتے کہ اب ایک دن اور کم ہو گیا ہے۔ بیٹھ کر یہی باتیں کرتے کہ اس دن کیا ہوگا۔ کیسا انقلاب آئے گا۔ ہم بچے سنتے تھے کہ اس دن کوئی زبردست زلزلہ آئے گا۔ یہ تمام لوڈی مر جائیں گے اور کانگریسی جیل سے باہر چلے جائیں گے۔ منّا کہتی تھی کہ انقلاب کا مطلب ہے کہ لوڈیوں اور کانگریسیوں کے درمیان لڑائی ہوتی ہے جس میں کانگریسی جیت جاتے ہیں اور انگریز ہمیشہ کے لیے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ نمّی کہتی انقلاب کے دن اس کے پتا جی بھی یہاں آجائیں گے۔ نمّی کے پتا لالہ اچنت رام جی بھی ۸ر اگست ۱۹۴۲ء کو ہمارے بی بی جی اور بابو جی کے ساتھ لاجپت رائے بھون سے گرفتار ہوئے تھے۔

ہمارے ذہنوں میں یہ بات گھر گئی تھی کہ جیل میں رہ کر اپنے والد کو یاد کرنا کمزوری کی نشانی ہے۔ اسی لیے ہم نمّی کو بھلا برا کہتے کیونکہ وہ اپنے پتا جی کو بہت یاد کرتی تھی۔ ہم بار بار یہی بات دہراتے کہ جو عظیم لوگ شہید ہوئے ہیں وہ پھانسی کی کوٹھری میں بیٹھ اپنے والدین کو کبھی یاد نہیں

کرتے تھے۔ بھگت سنگھ نے تو پھانسی کی کوٹھری سے اپنی ماں کو ایسے خط لکھے تھے، جس میں وطن پرستی اور بہادری کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔

چونکہ بھگت سنگھ اور بہت سے دوسرے انقلابی ہمارے والد پرنسپل چھبیل داس کے نیشنل کالج لاہور میں طالبِ علم رہ چکے تھے، اس لیے ہمیں بھگت سنگھ کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ہمارے بابوجی ہمیں بتاتے تھے کہ بھگت سنگھ کتنا بہادر تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا یہ نوجوان کسی بھی خطرے سے خوف نہ کھاتا اور اکثر ہنستے ہوئے اس نے ہمارے بابوجی سے کہا تھا "گروجی موت تو اس محبوبہ کی طرح ہے جسے میں ہر وقت گلے لگانے کے لیے تیار ہوں" ہمارے گھر میں کچھ ایسی کتابیں موجود تھیں جنھیں بھگت سنگھ پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک کتاب تھی "کرائی فار جسٹس" (Cry for Justice) یعنی انصاف کی پکار۔ یہ وہ مشہور کتاب ہے جس کے بہت سے حصوں پر بھگت سنگھ نے لال پنسل سے نشان لگا رکھے تھے۔ ہمارے بابوجی ہمیں بتاتے کہ یہ حصے بھگت سنگھ کو بہت پسند تھے اور وہ انھیں بار بار پڑھتے تھے۔ ملک کی تقسیم کے وقت جب ہم لوگ لاہور چھوڑ کر چلے آئے تو دوسری بہت سی چیزوں کے ساتھ بھگت سنگھ کی یہ پسندیدہ کتاب "Cry for Justice" بھی لاہور ہی میں ہمارے گھر لاجپت رائے بھون میں رہ گئی۔

اُس وقت ہم بہت چھوٹے بچے تھے۔ ہم نے بھگت سنگھ کے ان خطوں کو نہیں پڑھا تھا جو انھوں نے پھانسی کی کوٹھری سے اپنی ماں اور بہنوں کو لکھے

تھے۔ لیکن ہم سبھی ان خطوں کے مطابق بہت سی تفصیلات جانتے ہیں اور اکثر انھیں دہرایا کرتے ہیں۔ خود مجھے بھی اپنے بابوجی کی یاد بہت آتی لیکن میں اپنے ساتھیوں کو خوف کے مارے یہ نہیں بتاتی کہ کہیں وہ مجھے کمزور یا ڈرپوک نہ سمجھ لیں۔ اُن دنوں ہم وطن پرستی کے جذبے پر کسی طرح کی آنچ نہیں آنے دینا چاہتے تھے اسی لیے اگر کوئی جیل میں ہم سے پوچھتا کہ کیا ہمیں اپنے بابوجی کی یاد نہیں آتی تو میں اور اشوک ایک ساتھ چلاّ کر کہتے "نہیں بالکل نہیں" یہی حال دوسرے بچوں کا بھی تھا۔

جیل میں رہتے ہوئے ہم جیل کی زندگی کے عادی سے ہو گئے تھے۔ اب ہم وہاں کے ماحول سے مانوس ہو گئے تھے۔ لاجپت رائے بھون کے باغیچوں کی جگہ اب ہم نے جیل کے پیڑوں کے پیچھے ہی آنکھ مچولی کھیلنے کی جگہ بنالی تھی۔ اب ہم ایک کھیل کھیلتے جس میں کاغذوں، پتھروں، اینٹوں اور دیواروں اور کسی بھی چھپی ہوئی جگہ پر لکیریں کھینچنے کا مقابلہ کرتے۔ دو ٹولیاں بن جاتیں اور آپس میں لکیریں کھینچنے کا مقابلہ ہوتا اور بعد میں ان لکیروں کی گنتی ہوتی۔ جیل کا چوکیدار ہمیں روز منع کرتا کہ ہم جیل کے پھاٹک پر ایسی لکیریں نہ کھینچیں، لیکن ہم ایسا کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ آئے دن انھی لکیروں کو لے کر ہمارا جھگڑا ہوتا تھا۔

ایک دن منّا نے کہا اگر آج چوکیدار نے لکیریں کھینچنے کو منع کیا تو ہم اسے ماریں گے۔ ہم سب زور زور سے چوکیدار کو چڑانے کے لیے کہتے "ہم تو لکیروں میں وہ دن گن رہے ہیں جب انگریز ہندوستان سے بھاگ

جائیں گے۔ چوکیدار سچ مچ ان لکیروں کو گننے لگا وہ لکیریں ہزاروں کی تعداد میں جا پہنچی تھیں۔ چوکیدار ہمیں کہتا اگر تم انگریزوں کو ان لکیروں کے ذریعے ہٹانا چاہتے ہو تو بہت کم لکیریں کھینچو۔ ہم نے مل کر فیصلہ کر لیا کہ اب ہم جیل کے بڑے پھاٹک پر لکیریں نہیں کھینچیں گے کیونکہ ہم تو چاہتے تھے کہ انگریز فوراً ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں۔

اسی طرح ہمارا بہت سا وقت پھانسی کی کوٹھریوں کے اطراف چکر لگانے میں بیت جاتا تھا حالانکہ ان کوٹھریوں کی طرف کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ ہمیں بھی وہاں جانے کے لیے منع کیا جاتا تھا لیکن ہم بچے بیر توڑنے کے بہانے کسی نہ کسی طرح ایک بار وہاں کا چکر لگا ہی آتے۔ ہم ان کوٹھریوں میں قید عورتوں کو خوف کی نظروں سے دیکھتے۔ اشوک تو ایک آنکھ بند کر کے انھیں دیکھتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہم بچے چاہے کتنی ہی شیخیاں بگھارتے تھے، لیکن پھانسی کی ان کوٹھریوں سے خوف ضرور کھاتے تھے۔

ایک بار کوٹھری کے اندر کی ایک قیدی نے آنکھ کے اشارے سے مجھے بلایا۔ جب میں اس کے پاس پہنچی تو اس نے میرا نام پوچھا اور مجھ سے کہا "میں تمھیں کچھ نہیں کہوں گی۔ تم یہاں سے ڈر کر مت بھاگو۔ مجھ سے باتیں کرو" میرا خوف کم ہو گیا اور میں ہر روز اس عورت کے پاس جا کر باتیں کرنے لگی۔

پھانسی کا انتظار

حالانکہ چوکیدار ہم بچوں کو پھانسی کی کوٹھریوں کی طرف جانے سے روکتا

تھا، لیکن ہم اسے باتوں میں لگا لیتے ، ہم چوکیدار کو خوب ہنساتے اس لیے وہ ہمیں ادھر جانے دیتا۔ شاید وہ سوچتا ہوگا کہ ہم لوگ چھوٹے بچے ہیں، جیل میں ہی رہتے ہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اسی طرح میری پھانسی کی کوٹھریوں میں رہنے والی قیدیوں سے دوستی ہوگئی۔

اس قیدی کا نام بلیندر کور تھا۔ وہ کوئی اڑتیس سال کی عورت تھی۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ تم جیل کیوں آئی تھیں۔ میری ماں تو دفعہ ۱۲۶ میں گرفتار اے کلاس قیدی ہیں، لیکن تم کیوں پھانسی کی کوٹھری میں بند ہو۔ اس نے مجھے ایک لمبی سی داستان اپنے جیل آنے کی بابت سنائی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ کسی کا خون کر کے جیل آئی ہے۔ میں نے اس سے یہ پوچھا تھا "کیا تم نے کسی انگریز کا خون کیا تھا؟" جب اس نے جواب دیا "نہیں" تو مجھے کافی پریشانی اور مایوسی ہوئی۔

اب سوچتی ہوں کہ میں بلیندر کور سے کتنی بے رحمی سے باتیں کرتی تھی۔ میں ہر روز اس سے پوچھتی "تمہیں پھانسی کب لگے گی۔ میں بھی پھانسی دیکھوں گی"۔ وہ کہتی پھانسی لگنے میں ابھی کافی دن ہیں۔ وہ میرے ماں باپ، بھائی بہنوں اور دوسرے رشتے داروں کے بارے میں بہت سے سوال پوچھتی اور کہتی کہ میں تمہاری ماں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔

ایک دن میں اس سے ملنے گئی تو وہ بہت اداس تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے مجھ سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ محض اتنا کہا "منی کل مجھے پھانسی لگ رہی ہے"۔ کیونکہ میں پھانسی دیکھنا چاہتی تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا

کریں بلبندر کور کو پھانسی لگتے دیکھوں گی، یہ سوچ کر میں وہاں سے بھاگ گئی۔

اس دن شام اور رات میں نے بہت پریشانی، بے قراری اور انتظار میں گزاری۔ میں نے کسی دوسرے بچے کو نہیں بتایا کہ میں پھانسی دیکھنے جا رہی ہوں۔ مجھے ڈر تھا کہ دوسرے بچے بھی ساتھ چلیں گے وہاں شور ہوگا اور بنی بنائی بات بگڑ جائے گی۔ میں نے بی بی جی سے بھی یہ نہیں بتایا کیونکہ میں جانتی تھی کہ وہ مجھے منع کر دیں گی۔

اگلے دن میں بھاگتی ہوئی پھانسی کی کوٹھری کے پاس پہنچی تو کوٹھری خالی تھی۔ آس پاس پولیس کے لوگ کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بلبندر کور کہاں گئی، تو ان میں سے ایک نے جواب دیا کہ بلبندر کور کو تو بہت صبح پھانسی لگا دی گئی۔ جیل کے قاعدے کے مطابق پھانسی صبح سویرے ہی لگائی جاتی ہے۔ مجھے بے حد افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے پھانسی نہیں دیکھی اور بیچاری بلبندر کور کو بیکار میں پھانسی لگ گئی۔ نہ جانے کیوں اس وقت میرے ننھے ذہن کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر میں شروع ہی سے منع کر دیتی اور پھانسی دیکھنے کی اتنی خواہش ظاہر نہ کرتی تو بلبندر کور کبھی پھانسی کے تختے پر نہ جاتی۔

بلبندر کور کی موت نے مجھ میں کسی کو پھانسی لگتے دیکھنے کی خواہش اور بھی تیز کر دی۔ میں دوسرے بچوں کے ساتھ ہر روز اسی کوٹھری کے پاس آتی جس میں کبھی بلبندر کور رہتی تھی۔ ایک دو منٹ وہاں رکتی۔ کافی دن تک وہ کوٹھری خالی رہی لیکن ایک دن اپنی عادت کے مطابق جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں کوئی دوسری عورت قید تھی۔ میں نے چھوٹتے ہی اس سے پوچھا کہ تم نے بھی کسی کو جان سے

مارا ہے۔ کیا تمہیں بھی پھانسی ہوگی؟ تم بھی بلبندر کور کی طرح مجھے دھوکہ نہ دے جانا۔ مجھے اپنی پھانسی ضرور دکھانا۔ آج سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے، میری باتوں سے اس عورت پر نہ جانے کیا بیتی ہوگی۔ اسے معلوم تھا کہ اسے جلد ہی پھانسی کے تختے پر لٹک جانا پڑے گا۔

اور ایک دن پھانسی کا تختہ دیکھنے کی خواہش پوری ہو ہی گئی۔ کیونکہ ہم بچے سارا دن جیل میں ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے، اس لیے ہماری دوستی وہاں بہت سے لوگوں سے ہوگئی تھی۔ میں نے پھانسی کی کوٹھریوں کی انچارج میٹ جو کم سے کم ۶ فٹ لمبی کالی بھجنگ عورت تھی، سے دوستی کرلی۔ اس عورت کا نام بھاگ ونتی تھا۔ جیل میں یہ بات سبھی کہتے تھے کہ بھاگ ونتی اس کا اصلی نام نہیں ہے، کیونکہ اس کی ڈیوٹی برسوں سے پھانسی والی کوٹھری پر لگی تھی اس لیے اسے بھاگ ونتی کہا جاتا تھا۔ شاید اس لیے کہ بہت سی عورتوں کی قسمت میں اسی سے اپنی کوٹھری کا دروازہ کھلوا کر پھانسی کے تختے تک چلنا تھا۔

یہ کام کرتے کرتے بھاگ ونتی کی شکل بھی بہت کریہہ اور ظالمانہ ہوگئی تھی۔ بچے اس سے ڈرتے اور اسے پھانسی والی کہہ کر پکارتے تھے۔ میں نے اکثر دیکھا تھا کہ جب بھی وہ اپنے لیے 'پھانسی والی' نام سنتی تو وہ مسکرا دیتی۔ آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ وہ مسکراہٹ خوشی کی نہیں بلکہ غم میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں جب بھی 'پھانسی والی' سے باتیں کرتی، مجھے محسوس ہوتا کہ وہ دیکھنے میں جتنی سخت اور ظالم لگتی ہے، اس کا دل ویسا نہیں ہے۔ وہ مجھے

بہت پیار کرتی تھی کیونکہ جب بھی اُس سے میرا آمنا سامنا ہوتا، میں اُسے ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتی۔ دوسرے بچے مجھے یہ کہہ کر چڑاتے تھے کہ میں اس پھانسی دینے والی عورت کو ایسے نمستے کرتی ہوں جیسے ٹوڈی انگریزوں کو سلام کرتے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں ان بچوں کی خوب پٹائی کرتی لیکن میں چپ رہ جاتی تھی کیونکہ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ میں پھانسی والی سے دوستی کیوں کر رہی ہوں۔ اگر دوسرے بچوں کو پتہ چل جاتا تو وہ سب بھی ضد کرتے کہ وہ بھی کسی کو پھانسی لگتے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ایک دن بھاگ ونتی بہت اچھے موڈ میں تھی۔ میں نے اس کے دوپٹے کا پلہ پکڑ کر کہا تم مجھے پھانسی ہوتے کب دکھاؤ گی؟ اس پر وہ کہنے لگی "چھوٹے بچے پھانسی کا نظارہ دیکھنے سے بیمار ہو جاتے ہیں۔" میں نے چھوٹتے ہی کہا "اگر کل مجھے انگریز کانگریسی ہونے کے جرم میں پھانسی کی سزا دیں تب بھی تو میں پھانسی کے تختے کو دیکھوں گی۔ اگر میں کسی خونی انگریز کا خون کر کے اسی جیل میں آؤں گی اور پھانسی کی کوٹھری میں رکھی جاؤں گی، تب بھی تو بھاگ ونتی ہی مجھے لے کر پھانسی کے تختے پر جائے گی۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ میں پھانسی کے تختے سے ذرا بھی نہیں ڈرتی۔ آج بھاگ ونتی کے ساتھ ہوئی اس گفتگو کے متعلق سوچ کر مجھے ہنسی آتی ہے کہ میں کسی ظالم انگریز کا خون کرنے کی بات کس شیخی اور مسرت سے کر رہی تھی اور بھاگ ونتی نے بھی میرا مذاق نہیں اڑایا تھا۔

میرے بہت ضد کرنے پر بھاگ ونتی مان گئی اس نے بتایا پرسوں صبح ایک عورت کو پھانسی لگنے والی ہے وہ مجھے اس شرط پر پھانسی دکھائے گی

اگر میں کسی دوسرے سے اس کا ذکر نہ کروں اور چپ چاپ بنا بولے پھانسی کا نظارہ دیکھوں۔ میں نے وعدہ کیا۔ بہت سے چکّر کاٹنے کے بعد بھاگ۔ وتی مجھے ایک ایسی دیوار کے پاس لے گئی جہاں ایک چھید تھا۔ اس نے مجھ سے کہا پرسوں صبح پانچ بجے یہیں آجانا اور چپ چاپ پھانسی کا نظارہ دیکھ لینا۔ یہ دیوار جیل کے اسپتال کے پاس ہی تھی۔

جیل کا یہ قاعدہ تھا کہ جس دن کسی کو پھانسی لگنی ہوتی، اس دن تمام قیدیوں کو تالے میں بند کر دیا جاتا تھا۔ پھانسی کا کام ختم ہونے کے ایک گھنٹے بعد تالے کھلتے تھے۔ لیکن یہ قاعدہ سیاسی قیدیوں پر لاگو نہیں ہوتا تھا۔ کسی کو بھی پھانسی کی جگہ کے قریب جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جس دن کسی کو پھانسی لگتی، سارے جیل میں خاموشی اور اُداسی طاری ہو جاتی۔

میں نے وہ ڈیڑھ دن بہت مشکل سے گزارا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وقت پوچھتی۔ اس سے بی بی جی بھی ناراض ہو گئی تھیں۔ کہنے لگیں تمہیں کہاں جانا ہے جو بار بار وقت پوچھ رہی ہو۔ میں انھیں بتانا نہیں چاہتی تھی۔ نہ جانے میرے ننھے دل نے اتنا بڑا راز کیسے سنبھال کر رکھ لیا۔ اگلا سارا دن اکھڑے من سے ادھر ادھر گھوم کر گزارا۔ ہمیں معلوم تھا کہ جیل کے بڑے میدان کا ایک چکّر بیس منٹ میں لگتا ہے۔ وقت کاٹنے کے لیے میں اس میدان کے بہت سے چکّر کاٹتی رہی۔ رات بھر نیند نہیں آئی کیونکہ میں سونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ یہی خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صبح میری آنکھ نہ کھلے اور پھانسی ختم ہو جائے۔ آنکھیں بند کر کے پڑی رہی کہ بی بی جی کو معلوم نہ ہو جائے کہ میں جاگ رہی ہوں۔

صبح ساڑھے چار بجتے ہی میں بھاگ کھڑی ہوئی - جلدی سے اپنا اچھا سا فراک پہنا - اس وقت دل میں یہ خیال نہیں تھا کہ میں کسی کی موت کا نظارہ دیکھنے جا رہی ہوں - دوسرے بچے ابھی سو ہی رہے تھے البتہ بی بی خود جاگ چکی تھیں - میں ان سے یہ کہہ کر کہ ابھی آتی ہوں، بھاگ کھڑی ہوئی - چونکہ جیل کی چہار دیواری میں بچوں کے گم ہو جانے کا ڈر نہیں تھا اس لیے ہمیں گھومنے پھرنے سے منع نہیں کیا جاتا تھا - میں تیزی سے بھاگتی ہوئی اس دیوار کے پاس پہنچ گئی جو مجھے بھاگ وتی نے دکھائی تھی اور اسی چھید پر آنکھیں گڑا کر کھڑی ہو گئی - میں نے دیکھا ابھی تک پھانسی کی جگہ خالی تھی -

تھوڑی سی دیر بعد مردوں کی جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور عورتوں کی جیل کی سپرنٹنڈنٹ دونوں آئے - ان کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی تھا - بعد میں مجھے پھانسی والی نے بتایا کہ وہ ڈاکٹر تھا جو پھانسی سے پہلے اور بعد قیدیوں کا معائنہ کرتا ہے - ان لوگوں نے آکر ادھر ادھر دیکھا - پھر کوئی دس بارہ پولیس کی عورتیں ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے لیے وہاں آگئیں اور انھوں نے اپنی جگہ سنبھال لی - میں سانس روکے کھڑی تھی اور میری نظر پھانسی کے پھندے پر گڑی تھی -

تھوڑی دیر بعد بھاگ وتی اور پولیس کی تین عورتیں ایک عورت کو وہاں لائیں مجھے پتہ نہیں چلا کہ کچھ منٹوں تک کیا ہوتا رہا - نہ قیدی نظر آرہی تھی اور نہ ہی ڈاکٹر - شاید ڈاکٹر اس کا معائنہ کر رہا تھا - پھر پولیس نے آکر اس عورت کو جس نے نیلی دھاری والی قمیص پہنی تھی لاکر کھڑا کر دیا - پھانسی لگانے والے

جلاد نے اس کے منہ پر نقاب ڈالا اور پھانسی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے گھڑی میں وقت دیکھا اور نہ جانے کیسا اشارہ کیا کہ ایک ہی لمحے میں پھانسی کا پھندا کس گیا اور وہ نازک سی دکھائی دی جانے والی عورت ایک گڑھے میں نیچے چلی گئی۔ مجھے بار بار خیال آرہا تھا کہ شاید پھندا ٹھیک نہ کسا ہو اور وہ جیتی ہو۔ میں نے دیکھا کہ پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال کر اس عورت نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور ڈاکٹر بھی اسی گڑھے میں چلے گئے تھے کچھ دیر لگا رہ کر تو واپس آگئے لیکن مرنے والی کی لاش مجھے دکھائی نہیں دی میں کچھ منٹ اور کھڑی رہی لیکن پھر یہ خیال آیا کہ کہیں بی بی جی ڈھونڈھ نہ رہی ہوں کیونکہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنا وقت بیت چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جھید سے جھانکا پولیس ابھی تک کھڑی تھی، لیکن میں وہاں سے واپس آگئی۔

اب تک سب بچے جاگ چکے تھے وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ میں کہاں تھی۔ میں نے جھوٹ موٹ کہہ دیا کہ میں تو بیری کے پیڑ کے نیچے بیر چن رہی تھی۔ بی بی جی تیرحنہ کلاس میں جا چکی تھیں۔ میں نے جا کر دودھ پیا اور توس کھایا، لیکن میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا پھندا ناچتا رہا۔

اس دن مجھے بھاگ دتی نہیں ملی۔ میں دن بھر پریشان گھومتی رہی۔ رات کو میں نے بی بی جی سے پوچھا "جب پھانسی لگتی ہے تو کتنا درد ہوتا ہے؟" وہ بولیں "یہ تو وہی بتا سکتا ہے جسے پھانسی لگتی ہے" میں نے بی بی جی کو بتایا کہ آج صبح میں نے کس طرح ایک عورت کو پھانسی لگتے دیکھا ہے۔ پہلے تو میری ماں نے سمجھا کہ یہ میرا سپنا ہے لیکن جب میں نے پھانسی کے نظارے

کی پوری تفصیل سُنائی تو انھیں یقین ہوگیا کہ میں نے سچ مچ پھانسی کا نظارہ دیکھا ہے۔ وہ چُپ چاپ سنتی رہیں اور بعد میں کہنے لگیں اب دوبارہ وہاں کبھی مت جانا۔ اگلے دن بی بی جی نے بھاگ ونتی کو بلاکر غصہ سے کہا "تم بھی کمال کرتی ہو کیا اتنے چھوٹے بچے کو پھانسی کا نظارہ دکھایا جاتا ہے۔"

خیر یہ قصہ تو یہیں ختم ہوگیا۔ اب 'پھانسی والی' بھاگ ونتی مجھ سے ناراض تھی کہ میں نے بی بی جی سے کیوں بتایا اور میں بھاگ ونتی سے خفا تھی کہ وہ اچھی بھلی عورت ہوکر کسی کو پھانسی پر چڑھانے کا کام کیوں کرتی ہے۔ اس دن کے بعد اس سے بات چیت کم ہوگئی۔ ہم بچے جب بھی گھومتے ہوئے پھانسی کی قیدیوں کی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرتے تو مجھے لگتا کہ کوٹھری میں بند ہر عورت پھانسی کے تختے پر جھول رہی ہے۔ میں آج تک اس گمنام عورت کے چہرے اور آنکھوں کو نہیں بھلا پائی ہوں جسے میں نے اس دن پھانسی لگتے دیکھا تھا۔

جب برٹش جیل پر ترنگا لہرایا

ادھر جیل میں آٹھ اگست کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس بڑے کمرے میں جہاں ہر روز چرخے کی کلاسیں ہوتی تھیں، وہیں رات کو دیر تک میٹنگیں ہوتیں جن میں بہت دھیمی آوازیں باتیں کی جاتیں۔ ہم بچوں کو ان میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔ ستیہ وتی چاچی کا کہنا تھا کہ بچے تو سی، آئی، ڈی کی طرح ہوتے ہیں کوئی بات ان کے سامنے کرو، وہ جھٹ سے پیٹ میں بھر لیں گے۔ ان کا کیا پتہ کس سے باتیں کرتے پھریں۔

ہم بچوں کو یہ تو نہیں پتہ تھا کہ ۸ اگست کو کیا ہوگا، لیکن ہم بے چینی سے اس دن کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم ہر روز کلینڈر دیکھتے اور گنتے کہ اب ۸ اگست کو کتنے دن رہ گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ عورتوں نے اپنی ساڑیوں کو پھاڑ پھاڑ کر جوڑا اور اپنے ہاتھوں سے ڈھیروں ترنگے جھنڈے بنائے ہماری ماں کے پاس کھادی کی ایک ہری ساڑی تھی، جسے وہ بہت شوق سے پہنتی تھی اسی ساڑی کو پھاڑ کر ترنگے جھنڈوں میں ہرا رنگ لگایا گیا۔ ساڑی

جی کی ساڑی اور ستیہ وتی چاچی جی کی سفید ساڑی تھی اس لیے مذاق میں ان جھنڈوں کو سیتا ساوتری ستیہ وتی کہا جاتا تھا۔

ہر عورت نے اپنے لیے سفید رنگ کی شلوار قمیص اور دوپٹہ بنایا۔ کندھے پر لگانے کے لیے ترنگا بیج بھی تھا۔ ۸ اگست کی شام کو سب نے وہی شلواریں پہنیں اور کس کر دوپٹے باندھ لیے۔ ایک دم کسی نے آکر کہا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ بیرک بند کرنے آرہی ہیں۔ ایک چارپائی کو بیرک کے دروازے میں فٹ کر دیا گیا اور بہت سے دوپٹوں اور چارپائی کی رسیوں سے اسے کس کر باندھ دیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ آئی اور چپ چاپ راؤنڈ لے کر چلی گئی۔ اس وقت ساری عورتیں شام کی عبادت میں لگی تھیں۔ عبادت کے بعد روز کی طرح نعرے لگائے گئے۔ سب قیدیوں نے مل کر کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے میں نے بی بی جی سے پوچھا "آج کیا ہوگا" وہ کہنے لگیں "کچھ نہیں تم لوگ آرام سے سو جاؤ"۔ ہماری چارپائیاں ہر روز کی طرح باہر لگا دی گئیں، ہم ان پر لیٹے لیٹے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس وقت سارا ماحول خاموش تھا، بالکل ویسے ہی جیسے کسی طوفان سے پہلے خاموشی ہوتی ہے۔

آدھی رات کے تین بجے۔ اب ۹ اگست ہو چکا تھا۔ ہلچل شروع ہوئی۔ میں اور نمی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ دوسرے بچے سو رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ایک چارپائی اٹھا کر چار پانچ عورتیں جیل کے پھاٹک کی طرف جا رہی تھیں ہمیں ڈانٹا گیا کہ ان کے پیچھے نہ آئیں۔ ہم کھڑے ان کی طرف دیکھتے رہے۔ ہمیں

یہ احساس تھا کہ اس وقت شور نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کوئی بہت بڑا واقعہ ہونے والا ہے۔ ہم نے دور سے دیکھا کہ ان عورتوں نے چار پائی پر کھڑے ہو کر پھر ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوتے ہوئے اتنی اونچی دیوار بنا ڈالی کہ وہ جیل کی دیوار سے اونچی ہو گئی۔ سب سے اوپر دلی کی مشہور کانگریسی کارکن میمو بائی چڑھ گئیں اور انھوں نے جیل کے پھاٹک کے اوپر لگے یونین جیک کو اتار کر ترنگا جھنڈا لگا دیا۔ یہ بڑا سا جھنڈا عورتوں نے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا۔ جھنڈا لگانے کے بعد عورتیں خاموشی سے واپس آگئیں اور آکر بیرک کے سامنے میدان میں اس طرح بیٹھ گئیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

طوفان شروع ہو چکا تھا۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ترنگا جھنڈا بھی لہرانے لگا۔ تصور کیجیے کہ یہ کتنا بڑا طوفان تھا۔ برٹش سامراجی جیل پر ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی محض جیل ہی میں نہیں بلکہ سارے لاہور میں تہلکہ مچ گیا کہ جیل کے اوپر ترنگا لہرا رہا ہے۔ چاروں طرف شور ہی شور تھا۔ جن سیاسی قیدیوں کو باقاعدہ مقدمہ چلا کر سزا ملی تھی، انھیں الگ بیرکوں میں رکھا گیا تھا۔ فوراً ان کی بیرکوں پر تالا لگا دیا گیا۔ وہاں سے نعروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جس عورت کے پاس ان بیرکوں اور ان کے باہر سے پھاٹکوں کی چابیاں تھیں، سیاسی قیدیوں نے اسے گرا کر چابیوں کا گچھا چھین لیا اور سارے تالے کھول دیے۔ اس طرح تمام سیاسی قیدی جیل کے بڑے پھاٹک کے پاس جمع ہو گئے تھے۔

جب جیل سپرنٹنڈنٹ مسز سوداگر سنگھ نے جیل پر ترنگا جھنڈا لہراتے

دیکھا تو اس نے زور سے چھاتی پیٹ کر کہا " ہائے ہائے میں مر گئی۔" وہ بھاگی ہوئی گئی اور اس نے مردوں کی جیل کے سپرنٹنڈنٹ اور انسپکٹر جنرل پولیس کو فون کیا۔ فوراً ترنگا جھنڈا اتار دیا گیا اور پھر جیل پر یونین جیک لہرانے لگا۔

ساری عورتیں جیل کے پھاٹک کے پاس بڑا دائرہ بنا کر گانا گا رہی تھیں اور نعرے لگا رہی تھیں۔ ہم بچے ان کے پاس ہی کھڑے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ اسی وقت جیل کا پھاٹک کھلا۔ دونوں جیل سپرنٹنڈنٹ اور فوج کے بہت سے لوگ بندوقیں اور برین گنیں اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ آتے ہی مردوں کی جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے چلّا کر کہا " میں حکم دیتا ہوں کہ دس منٹ کے اندر یہ دھرنا بند کیا جائے۔"

ہوا یہ تھا کہ سیاسی قیدیوں نے جیل کے اس بڑے پھاٹک کے سامنے دھرنا دیا تھا، جس کے اندر جیل کے تمام قیدی تھے۔ اس دھرنے نے آنے جانے کے سارے راستے بند کر رکھے تھے۔ اس پھاٹک کے بند ہونے سے جیل کا سارا کام ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔

سپرنٹنڈنٹ کی اس دھمکی کا سیاسی قیدیوں پر کوئی بھی اثر نہیں ہوا اور انھوں نے زور زور سے نعرے لگانے شروع کر دیے وہ سب گانا بھی گاتی جا رہی تھیں۔

" انقلاب زندہ باد

لاٹھی گولی سنگٹھ جیل

ظالم کا ہے انتم کھیل"

ہم بچے بھی ان نعروں اور گانوں میں ساتھ دے رہے تھے۔ ہم میں سے ایک بچہ نعرہ اٹھاتا اور باقی اس کا جواب دیتے۔ ایک نعرہ جو ہم بار بار لگا رہے تھے وہ تھا "ہم کیا چاہتے ہیں"۔ "آزادی"

"انگریزو!" "بھارت چھوڑو"

نعروں کا یہ سلسلہ کوئی آدھا گھنٹہ اور چلتا رہا جب جیل سپرنٹنڈنٹ نے دیکھا کہ یہ عورتیں آسانی سے ماننے والی نہیں ہیں تو اس نے حکم دیا کہ جیل کے اندر سے عام قیدیوں اور پولیس کی عورتوں کو بلا کر تمام سیاسی قیدیوں کو ہٹایا جائے۔ اب مصیبت یہ تھی کہ اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ تمام راستے ان سیاسی قیدیوں نے بند کر رکھے تھے۔ یہ سیاسی قیدی ٹس سے مس ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔ جب اور کوئی راستہ نہیں سوجھا تو ہار کر ایک طرف پاخانے میں رکھے بڑے بڑے ڈبوں کو ہٹا کر وہاں سے جیل سپرنٹنڈنٹ اندر گئے اور اسی راستے؛ وہ دوسری عورتوں کو بھی لے آئے انھوں نے حکم دیا کہ ان عورتوں کو اٹھا کر اندر کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔

جب پولیس کی عورتیں اور دوسری عام قیدی آگے بڑھیں تو سیاسی قیدیوں نے نعرہ لگایا "یہ کون ہیں"۔ "ہماری بہنیں"۔ "بہنیں، بہنوں پر ظلم نہیں ڈھا سکتیں۔" یہ سنتے ہی وہ تمام عورتیں پیچھے ہٹ گئیں۔ انھوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتیں۔ سپرنٹنڈنٹ گرج کر بولا" میں تم سب کو شوٹ کروا دوں گا۔ اگر تم نے یہ کام نہیں کیا تو؛ یہ سن کر ہم بچوں

کو احساس ہوا کہ اب کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ اشوک کہنے لگا "بڑا مزا آئے گا، اب گولی چلے گی۔" لیکن سپرنٹنڈنٹ کی غصے سے بھری لال لال آنکھیں اور ماحول کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے وہ چپ ہو گیا۔ اس وقت پورے ماحول میں بہت جوش تھا۔ کچھ دیر بعد پولیس کی عورتیں آگے بڑھیں اور انھوں نے نعرے لگاتی ہوئی ان سیاسی قیدیوں کو پکڑ لیا جن میں ہماری ماں بھی شامل تھیں۔ انھوں نے خوب ہاتھ پیر پٹکے اور خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن چار چار عورتوں نے ایک ایک سیاسی قیدی کو پکڑا اور انھیں لٹکاتی ہوئی جیل کے اندر کے حصہ میں لے گئیں۔ اس وقت بھی یہ عورتیں زور زور سے نعرے لگا رہی تھیں اور جیل کا سارا ماحول ان نعروں سے گونج رہا تھا۔ تب تک اندر کے پھاٹکوں کے سارے تالے ڈپلی کیٹ چابیوں سے کھولے جا چکے تھے۔

ہم بچے چیخ چیخ کر نعرے لگا رہے تھے اور ہماری ماؤں کو زبردستی اٹھا کر ان کوٹھریوں میں بند کیا جا رہا تھا جو پھانسی کی قیدیوں کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ہمیں دیر تک ان کے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ہم سبھی بچے وہیں گھرے ہوئے تھے۔ ہمیں خیال نہیں آیا کہ ہم کیا کریں گے۔ ایک بیریک کے پیڑ کے نیچے ہم لوگ بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔ منا کہنے لگی ان تمام قیدیوں کو کوٹھریوں میں بند کر رہے ہیں کہیں انھیں پھانسی تو نہ لگ جائے گی؟ میں نے منا کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ میری آنکھوں کے سامنے پھانسی کا نظارہ آگیا اور میں کانپ سی گئی۔ اسی

وقت جیل سپرنٹنڈنٹ مسز سوداگر سنگھ اور مردوں کے جیل کے سپرنٹنڈنٹ ہمارے پاس آئے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے اور انھیں ایسے گھور رہے تھے جیسے کوئی بھیڑیا آگیا ہو۔ انھوں نے کہا بچوں کو ان کے گھر بھجوا دیا جائے گا۔ یہ سنتے ہی ہم سب ایک ساتھ چیخ کر بولے "نہیں نہیں ہم گھر نہیں جائیں گے۔ ہمیں اپنی ماں کے پاس کوٹھری میں بھیج دو۔" یہ بات سن کر وہ دونوں ایسے مسکرائے جیسے فلموں میں ویلن مسکراتے ہیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے۔ "ہاں ہاں بچو! ہم تمہیں اندر بھیج دیں گے۔ ہمارے ساتھ آؤ۔" مجھے کھٹکا ہوا کہ یہ لوگ ہم بچوں کو باہر بھیجنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہم لوگ جیل کے پھاٹک سے باہر چلے گئے تو پھر آسانی سے واپس نہیں لوٹ پائیں گے، اسی لیے ہم نے کہا "ہم آپ کے ساتھ نہیں جائیں گے، یہیں بیٹھیں گے۔"

یہ دونوں جیل سپرنٹنڈنٹ، کافی دیر تک کھڑے ہو کر آپس میں باتیں کرتے رہے، لیکن پندرہ منٹ بعد وہاں سے چلے گئے۔ وہ انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی بات چیت میں ایک لفظ بار بار آ رہا تھا وہ تھا "ٹارچر" اس وقت تو مجھے انگریزی کے اس لفظ کا مطلب نہیں معلوم تھا لیکن بعد میں جب بی بی جی نے بتایا کہ "ٹارچر" کا مطلب "ستانا" ہے تو ہماری سمجھ میں آگیا کہ وہ مل کر سیاسی قیدیوں کو ستانے اور پریشان کرنے کی اسکیم بنا رہے تھے۔

ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ بیت گیا۔ دھوپ بھی تیز ہونے

لگی تھی اور ہم بچوں کو بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے بیرک میں کھانے کی بہت سی چیزیں رکھی ہیں، لیکن ہم میں سے کوئی بھی وہاں جانے کو تیار نہیں تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر ہم اندر چلے گئے اور کہیں باہر سے تالا لگا دیا گیا تو ہم اندر ہی پھنس جائیں گے۔ قریب ہی ایک نل تھا ہم بچے بار بار وہاں جاکر پانی پی آتے۔

ہم باتیں کرنے لگے کہ اب کیا ہوگا۔ ہم لوگوں کو کہیں یہ لوگ باہر تو نہیں بھیج دیں گے؟ میں بی بی کو چھوڑ کر جیل سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی اور مجھے یہ دیکھنے کی بھی خواہش تھی کہ ہماری ماں اور دوسری عورتوں کو کن کوٹھریوں میں بند کیا گیا ہے۔ ہم بچے بیٹھے پروگرام بناتے رہے کہ اگر ہمیں ہماری ماؤں کے پاس اندر نہ بھیجا گیا تو ہم کیا کریں گے۔ ہم لوگ اپنی بیرک میں اکیلے رہنے کے لیے بھی تیار تھے۔

نمی کہنے لگی کہ جیل کے پھاٹک کے آگے بھوک ہڑتال کر دوں گی اور تب تک اسے ختم نہیں کروں گی جب تک ہمیں جیل کے اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی۔

شاید اب پڑھنے والوں کو ہماری باتیں بے تکی اور اٹ پٹی سی لگ رہی ہوں، لیکن اس زمانے میں ہم بچے اکثر بھوک ہڑتال کی باتیں کرتے تھے کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ اگر ہم جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیں گے تو ملک آزاد نہیں ہو پائے گا۔

منا نے کہا کیوں نہ ہم بھی اپنی ماؤں کی طرح جیل کے پھاٹک کے سامنے

نعرے لگائیں اور دھرنا دے دیں۔ تب جیل سپرنڈنٹ ہمیں بھی جیل کی کوٹھریوں میں بند کر دیں گے۔ ہمیں منا کی تجویز بہت پسند آئی اور ہم سارے بچے جیل کے پھاٹک کے سامنے بیٹھ کر زوروں سے نعرے لگانے لگے۔ "انقلاب زندہ باد — ہم کیا چاہتے ہیں آزادی — ٹوڈی بچہ مردہ باد اور انڈین نیشنل کانگریس زندہ باد —"

ابھی ہمارے نعروں کا سلسلہ مشکل سے دس منٹ ہی چلا ہوگا کہ چوکیدار نے ہمیں آکر ڈانٹا اور چپ رہنے کے لیے کہا۔ ہم نے چوکیدار کو انگریزوں کا پٹھو کہہ کر چڑانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جیل سپرنڈنٹ آ گئے۔ ان کے ساتھ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال بھی تھیں۔ ان کے پیچھے پولیس کی چار عورتیں تھیں۔ جیل سپرنڈنٹ نے ہمارے پاس آکر کہا کہ اگر تم اندر آنا چاہتے ہو تو نعرے لگانا بند کر دو۔ ہم چپ ہو گئے۔ ہم سے کہا گیا کہ ہم ان کے پیچھے پیچھے آئیں۔ نمی نے میرے کان میں کہا کہ کہیں یہ ہمیں باہر تو نہیں لے جا رہے ہیں؟ میں نے نمی کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ چپ رہو۔ باہر کا راستہ تو سامنے ہے۔ ہم جیل کے اندر جا رہے ہیں۔

ہمیں جیل کے اندر لے جایا گیا۔ راستے میں یہ دونوں جیل سپرنڈنٹ آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ "یہ کانگریسی عورتیں بھی بلا کی عورتیں ہیں۔ نہ جانے ان کی ماؤں نے انھیں کیا کھا کر پیدا کیا ہے۔ ان کے بچوں نے بھی ناک میں دم کر رکھا ہے، اب نہ جانے اور کون سے چنے چبوائیں گے؟"
ہم بچے ان کی باتیں سن کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے

جاتے۔ ہماری آنکھوں کے اشارے ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ دیکھا ہماری ماؤں کا کمال۔ انھوں نے کس طرح انگریزوں کے پٹھوؤں کو مزا چکھایا ہے۔ ہم بچے بہت اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے، جیسے کسی ڈرامے کے ہیرو ہوں۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہم ان کوٹھریوں کے پاس پہنچ گئے جہاں ہماری مائیں قید تھیں۔ یہ کوٹھریاں خطرناک قیدیوں کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ان کے باہر ایک بہت بڑا پھاٹک تھا۔ پھاٹک کے اندر ایک چوڑا راستہ جاتا تھا جس کے دونوں طرف کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔

پھاٹک کھلا تو کوٹھریوں میں سے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے دیکھا کہ سبھی عورتیں اپنی بند کوٹھریوں کے دروازوں کے اندر سلاخوں کو پکڑے کھڑی نعرے لگا رہی تھیں۔ یہ نظارہ دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ مسٹر سوداگر سنگھ اور ڈپٹی جیل سپرنٹنڈنٹ مسز لال بہت گھبرائیں اور ماتھے پر پسینہ آگیا۔ گیلری کے ٹھیک بیچ کھڑے ہوکر سپرنٹنڈنٹ کہنے لگیں "تمہارے بچوں کو لائی ہوں نعرے لگانے بند کرو" اس پر بہت سی آوازیں ایک ساتھ آئیں "بچوں کا نام لے کر ہمیں مت ڈراؤ"۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ چیخ کر کہنے لگی "اس کا مطلب ہے تمہیں اپنے بچے نہیں چاہئیں۔ میں انھیں واپس لے جاتی ہوں"۔ ہم کبھی سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھتے اور کبھی کوٹھریوں کی طرف۔ اشوک مجھ سے پوچھنے لگا کہ بی جی کس کوٹھری میں ہیں؟ وہ کوٹھریوں کی طرف بھاگ گیا۔ پانچ چھ کوٹھریاں چھوڑ کر بی جی کی کوٹھری تھی۔ میں نے دیکھا کہ اشوک سلاخوں میں

سے بی بی جی سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا "آپ باہر کیوں نہیں آتیں۔ کیا آپ ان ٹوڈیوں سے ڈرتی ہیں۔ آپ باہر آئیے میں تالا کھولتا ہوں۔"

سپرنٹنڈنٹ کی دھمکی کا اثر یہ ہوا کہ سبھی عورتیں ایک آواز سے کہنے لگیں "ہمیں بچوں کے نام سے بلیک میل نہ کرو۔ انھیں لے جاؤ ملک کی آزادی کے لیے ہم سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔" یہ سن کر جیل کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال کہنے لگی: "بڑی ضدی ہیں یہ عورتیں۔ خیر لو اپنے بچوں کو" ہم بچے یہ سنتے ہی بھاگ کر اپنی اپنی ماؤں کے پاس پہنچ گئے۔

کوٹھریوں کے دروازے کھلے اور ہم اندر چلے گئے۔ اندر جاتے ہی اشوک نے وہاں کی ہر چیز کو غور سے دیکھا اور ان کے بارے میں بی بی جی سے سوال پوچھنا شروع کر دیے۔ یہ کوٹھری بارہ فٹ لمبی اور دس فٹ چوڑی تھی۔ فرش اور دیواروں پر کچی مٹی کی پتائی تھی۔ قیدیوں کے سونے کے لیے مٹی کا پلنگ نما چبوترا بنا ہوا تھا۔ ایک کونے میں پانی سے بھری صراحی رکھی ہوئی تھی۔ کوٹھری کے دونوں طرف مضبوط سلاخوں والے لوہے کے دروازے تھے۔ کھڑکی ایک بھی نہیں تھی۔ اگست کے مہینے میں لاہور میں ویسے بھی بلا کی گرمی ہوتی ہے لیکن یہ بند کوٹھری تو جیسے بھٹی کی طرح جل رہی تھی۔ ہم بچے گھبرا گئے۔ میں تو خاموش رہی لیکن اشوک کہنے لگا "میں اتنی گرمی میں نہیں رہوں گا۔ جیل والے سے کہو پھاٹک کھولے۔ میں باہر جاؤں گا۔" پہلے تو بی بی جی نے اشوک کو

بہت پیار سے سمجھایا کہ ہماری مرضی سے جیل کے دروازے نہیں کھل سکتے اسے پھسلانے کی کوشش کی۔ کہانی سنانے کا لالچ دیا۔ لیکن اس نے ضد ہی پکڑلی کہ وہ اس خوفناک گرمی میں اس بدبودار کوٹھری میں نہیں رہنا چاہتا۔ بی بی جی کو غصہ آگیا بولیں "مجھے تو یہیں رہنا ہے۔ اگر تم نہیں رہنا چاہتے تو میں کل تمہاری نانی کو خبر بھیج کر بلوالوں گی اور تمہیں گھر بھجوا دوں گی۔ یہ سن کر اشوک ذرا بھی نہیں ڈرا اور کہنے لگا " ہاں میں گھر جاؤں گا میں اندر اور دوسرے دوستوں کے ساتھ کھیلوں گا۔ مجھے اس گرم اور بدبودار کوٹھری میں نہیں رہنا ہے۔ میں نے اشوک کی باتیں سنیں تو میں ڈر گئی کیونکہ میں بی بی جی کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی میں نے کہا " مجھے یہاں بالکل گرمی نہیں لگتی میں یہیں رہوں گی " مٹی کے بنے پلنگ پر ہم دونوں بھائی بہن بیٹھ گئے وہ پلنگ بہت ہی سخت تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم اس پر کیسے سوئیں گے۔ تب تک ہمیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگر ہمیں اپنی ماں کے پاس اسی کوٹھری میں رہنا ہے تو ہمیں اسی چبوترے پر سونا ہوگا۔ بی بی جی کہنے لگیں تم دونوں اس پلنگ پر سو جانا، میں زمین پر سو جاؤں گی۔

اشوک اور میں دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑے ہوگئے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا آنگن بنا تھا جو چاروں طرف سے اونچی دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ اشوک کہنے لگا کہ آؤ ہم اس دروازے کو توڑ کر بھاگ چلیں۔ جیل والوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ یہ لوگ کدھر گئے ہیں۔ چونکہ میں اشوک سے بڑی تھی اور جانتی تھی کہ اس طرح ہم چھوٹے بچے جیل سے

بھاگ کر نہیں جا سکتے، اس لیے میں اشوک کی باتیں سن کر خاموش رہی۔ میں نے اس سے کہا "بھاگنے کی باتیں چھوڑو آؤ ہم مل کر کوئی گانا گائیں۔"

یکایک نہ جانے اشوک کو کیا خیال آیا کہنے لگا "اگر ہمیں پاخانہ جانا ہو تو کہاں جائیں گے؟" بی بی جی بولیں اب تو سبھی کچھ اسی کوٹھری کے اندر ہو گا۔ سامنے ایک بہت بڑا ڈبہ رکھا ہے، اسے استعمال کرو۔" تبھی دروازہ کھلا۔ ایک گندی سی تھالی میں روٹیاں، دال اور سبزی آگئی ساتھ ہی ایک لوٹے میں پانی بھی تھا۔

چونکہ ہم لوگ بھوکے تھے اس لیے بغیر ناک بھوں چڑھائے ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانا بہت بُرا تھا۔ اس میں کوئی ذائقہ نہیں تھا۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر اشوک سلاخیں پکڑ کر زور سے چلایا "نمی کیا تم نے گندا کھانا کھا لیا؟" کوئی دو کوٹھریاں چھوڑ کر نمی بھی سلاخیں پکڑے کھڑی تھی وہ کہنے لگی "میں نہیں کھاؤں گی گندا کھانا۔ میں اپنے پتا جی کو بتاؤں گی کہ یہ لوڈی بچے ہمیں اتنا گندا کھانا دیتے ہیں۔" بعد میں اشوک اور نمی نے مل کر لوڈیوں کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔

ان کی گالیوں کا سلسلہ تب تک ختم نہ ہوا، جب تک وہ بولتے بولتے تھک نہ گئے۔ مجھے بھی نیند آ رہی تھی۔ میں اور اشوک مٹی کے اس چبوترے پر سو گئے بی بی جی اپنی ساڑی کے پلّو سے ہمیں ہوا دیتی رہیں۔ اس کوٹھری میں بہت گرمی تھی۔ باہر بیرک میں ہمیں اس لیے بھی زیادہ گرمی نہیں لگتی تھی کیونکہ وہاں چاروں طرف بہت بڑے بڑے پیڑ تھے جن کے سائے

میں ہم سارا دن کھیلتے تھے اور پھر بیرک میں بجلی کا انتظام تھا اور پنکھا چلا کرتا تھا۔

کوٹھری میں اندھیرا ابھی تھا۔ جب شام ہوئی تو ایک ایک موم بتی دے دی گئی۔ اس وقت گرمی بہت پریشان کر رہی تھی۔ ہم بار بار بی بی جی سے پوچھتے کیا انھیں گرمی نہیں لگتی، تو وہ غصہ سے کہتیں "مجھے کچھ نہیں لگتا میں تم دونوں کو گھر بھیج دوں گی۔" شام کو ہم بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہم باہر کھیلنے جائیں گے۔ اس کے لیے ہم نے زور زور سے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ہم بچوں کو یہ یقین تھا کہ یہ نعرے کانگریسیوں کے بہت بڑا ہتھیار ہیں۔ شام کو سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ پر آئیں تو ہر کوٹھری سے نعروں کی آوازیں بلند ہوئیں "ظلم کرنے والو واپس جاؤ ـــــ کریں گے یا مریں گے ـــ ہم کیا چاہتے ہیں، آزادی ـــ انقلاب زندہ باد"

جیل سپرنٹنڈنٹ مسز سوداگر سنگھ کافی ڈرپوک عورت تھیں لیکن وہ ہمت کر کے اندر آگئیں۔ ہم نے ان سے کہا کہ ہم بچے باہر کھیلنے جائیں گے۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے فوراً کہا، ہاں بچے باہر کھیلنے جا سکتے ہیں۔ شاید اسے یہ خیال آیا ہو کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو سیاسی قیدی طوفان اٹھا دیں گے اور جیل میں سچ مچ انقلاب آجائے گا۔ تب بی بی جی نے ہم سے کہا کہ ہم بیرک میں جا کر پہننے کے کپڑے اور بستر لے آئیں۔ پولیس کی عورتیں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم راستے

پھر انھیں چھیڑتے گئے۔ یہ انگریزوں کے پٹھو ہمارے نوکر ہیں۔ ہمارے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ ہماری باتیں سن کر وہ ہنستی رہیں۔ شاید وہ سوچتی ہوں گی کہ ان سیاسی کارکنوں کے بچے بھی افلاطون ہوتے ہیں۔

کیونکہ ان کوٹھریوں سے باہر جانے کا راستہ خاصا لمبا تھا اس لیے ہم سب بچے یہی سوچ رہے تھے کہ نہ جانے کب ہماری ماؤں کو ان کوٹھریوں سے آزاد کیا جائے گا۔ ہم میں سے ہر ایک بچے کی یہی رائے تھی کہ ہمیں جیل میں رہنا اچھا تو لگتا ہے لیکن ان کوٹھریوں میں نہیں۔ اشوک سارے راستے یہی پکارتا رہا "میں تو گھر ماتاجی کے پاس جاؤں گا۔ میں اس گندی کوٹھری میں نہیں رہوں گا" میں اسے سمجھاتی رہی کہ یہ تو تھوڑے دن کی بات ہے۔ ہمیشہ تو بی جی کوٹھری میں نہیں رہیں گی۔ ہم اپنی بیرک میں آجائیں گے۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اشوک کو لینے کے لیے ہماری نانی جی آگئیں تو مجھے بھی واپس جانا پڑے گا۔ میں جیل سے نہیں جانا چاہتی تھی باتیں کرتے کرتے ہم بیرک میں پہنچ گئے۔ وہاں ہم نے اپنا سامان جمع کیا۔ کچھ کپڑے باہر پڑے تھے، انھیں اٹھا کر رکھا۔ کھانے کا سامان ایک ٹوکری میں ڈالا اور واپس کوٹھریوں کی طرف چل دیے۔ راستے میں جیل کا بڑا پھاٹک آیا تو اشوک کہنے لگا۔

"میں گھر جاؤں گا۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔ میں تانگہ والوں سے کہوں گا۔ گول باغ لاجپت رائے بھون لے چلو۔ تانگہ کے پیسے ہماری نانی جی دے دیں گی۔

خیر، میں نے اور ممی نے اشوک کو بہت سمجھایا اور اپنے ساتھ

واپس لے آئی۔ راستے بھر ہم لوگ مونگ کی تلی دال کھاتے رہے۔ یہ دال ہماری نانی جی نے کافی مقدار میں ہمارے لیے بھیجی تھی۔

کوٹھریوں میں واپس آکر ہم بچے اپنی اپنی ماں کی کوٹھری کے باہر کھڑے ہو گئے۔ کوٹھریوں کے تالے کھلے اور سامان اندر چلا گیا۔ ہم لوگ باہر ہی کھیلتے رہے۔ باہر کھیلتے ہوئے ہم ان کوٹھریوں ہی کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ نمی کہنے لگی کہ میں نے ایک قیدی سے بات کی ہے اور وہ مجھے بتا رہی تھی کہ ان کوٹھریوں سے باہر کوئی بھی جیتا واپس نہیں جاتا۔ جو قیدی بھی یہاں بند کیے جاتے ہیں، انھیں پھانسی لگتی ہے۔" مجھے نمی کی یہ بات بہت بری لگی۔ یہ سوچ کر بہت ڈر لگتا تھا کہ ہماری ماں اور دوسری عورتوں کو بھی پھانسی لگ سکتی ہے۔ میں نے نمی سے بحث کی کہ یہ بات غلط ہے۔ ان لوگوں نے کوئی خون نہیں کیا۔ مجھے بلیندر کور اور بھاگ ونتی سے پہلے ہی پتہ چل چکا تھا کہ جو لوگ خون کر کے آتے ہیں، انھیں پہلے پھانسی کی کوٹھریوں میں رکھا جاتا ہے اور پھر بعد میں پھانسی لگا دی جاتی ہے۔

اس وقت بحث کرتے ہوئے ہم بچے جو دلیلیں دیتے، وہ اِدھر اُدھر سے سنی ہوئی ہوتی تھیں۔ لیکن ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ جنگ آزادی کے لیے لڑائی کرنے والے سیاسی کارکنوں کو انگریز حکومت بہت خطرناک سمجھتی ہے۔ دوسرے بچے بہت چھوٹے تھے اس لیے انھیں پتہ نہیں تھا کہ پھانسی کیا چیز ہوتی ہے۔ لیکن نمی ان سب سے بڑی تھی اس لیے وہ کہنے لگی "میری بی بی جی نے بتایا ہے کہ بھگت سنگھ کو

بھی پھانسی لگی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ میری اور تمہاری دونوں کی بی بی جی کو پھانسی لگ جائے۔ بھگت سنگھ کا نام چونکہ ہمارے گھر کا ایک حصہ بن چکا تھا، اس کی اور اس کے پورے خاندان کی باتیں ہمارے گھر میں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ نیشنل کالج لاہور میں بھگت سنگھ ہمارے بابوجی کا چہیتا طالب علم بھی تھا، اس لیے بھگت سنگھ کا نام سنتے ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ شاید متا ٹھیک ہی کہتی ہے۔ ہمارے بابوجی اور بی بی جی بھی تو انقلابی ہیں۔ چونکہ پھانسی کی گفتگو ہم سبھی بچوں کو ڈرا رہی تھی اس لیے ہم نے اس پر آگے بات چیت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم بچوں نے واپس اپنی ماؤں کے پاس جانے کا فیصلہ کیا، کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اس کے سوا ہمارے سامنے کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ بجھے ہوئے دل سے اندر پہنچے تو بی بی جی کہنے لگیں کہ ہاتھ منہ دھو لو، آؤ کھانا کھالیں۔ یہ سن کر اشوک ایک دم سے بولا، اگر کھانا صبح جیسا گندا ہوا تو میں ہرگز نہیں کھاؤں گا۔" بی بی جی غصہ سے بولیں۔" یہ گھر نہیں ہے جہاں تم نے جو حکم دیا تمہاری دادی نے وہی پکا دیا۔ چپ چاپ سے کھالو جو کچھ بھی ہے۔"

ہم کھانے بیٹھے تو دیکھا کہ پانی جیسی پتلی دال اور سیتا پھل پکا ہوا تھا جس میں ذائقہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ چونکہ اشوک کو بی بی جی کی ڈانٹ پڑ چکی تھی اس لیے چپ چاپ تھوڑا سا کھانا کھالیا۔ اب سوال سونے کا

تھا۔ کوٹھری میں بہت زیادہ گرمی تھی۔ مچھروں کا بھی طوفان تھا۔ بی بی جی نے ایک سفید چادر اس مٹی کے چبوترے پر بچھا دی اور تکیہ رکھ کر ہمیں وہاں سو جانے کو کہا۔ اشوک میری طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ یہی کہنا چاہتا ہے کہ یہاں رات کیسے کٹے گی۔ بی بی جی نے اپنے لیے ایک دری فرش پر بچھالی تھی۔

ادھر سے نعروں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ انقلاب زندہ باد کی گونج سے بیرک کانپنے لگی۔ ہم دونوں بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ پتہ چلا کہ کوئی راؤنڈ پر آ رہا ہے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ مردوں کا جیل سپرنٹنڈنٹ اور کچھ پولیس کی عورتیں بھی تھیں۔ باہر کا پھاٹک کھلنے کی آواز آئی تو نعرے اور بھی تیز ہو گئے "ظالمو! واپس جاؤ ـــــ سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کرو ـــــ دشمن ہندوستان کے دل میں ڈر پیدا کرو۔" ابھی یہ گانا اونچی آوازمیں چل ہی رہا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ کی گرجتی ہوئی آواز آئی "آپ اس نعرے بازی کو چھوڑ کر میری باتیں سنیے۔ آپ کے گھروں میں اطلاع دے دی گئی ہے۔ آپ چاہیں تو کل اپنے بچوں کو گھر بھجوا سکتی ہیں۔"

سپرنٹنڈنٹ کی بات ختم ہوتے ہی ایک کوٹھری سے آواز آئی۔ "ہماری بات بھی سنیے۔ ہم اس کوٹھری کو پاخانے وغیرہ کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ ہمیں اس کے لیے باہر جانے کی اجازت دی جائے۔" ایک دوسری کوٹھری سے آواز آئی "اگر ہماری بات نہیں مانی گئی تو ہم سب کل صبح سے بھوک ہڑتال کر دیں گے۔" دو منٹ تک خاموشی رہی۔ پھر

سپرنڈنٹ نے کہا: "ٹھیک ہے آپ تالا کھلوا کر پولیس کی نگرانی میں باہر جا سکتی ہیں" یہ کہہ کر جیل سپرنڈنٹ اور پولیس کی عورتیں چلی گئیں۔ پھر تمام کوٹھریوں میں سے نعرے گونجنے شروع ہو گئے اور سبھی سیاسی قیدیوں نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔ جیسے وہ برٹش سامراج کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ ہم بچے بھی ان نعروں اور قہقہوں میں اپنی ماؤں کا ساتھ دے رہے تھے۔

ایک کوٹھری میں سے آواز آئی "کیوں سیتا کیا حال ہے؟" میری ماں ہنستے ہوئے بولیں "عیش کر رہے ہیں — انگریز سرکار کے دل پر مونگ دل رہے ہیں، تم بتاؤ کیا حال ہے؟" ادھر سے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ یہ بات چیت ستیہ وتی جی (مسز راجپت رام) اور ہماری بی بی جی کے درمیان ہو رہی تھی۔ ہم دونوں بھائی بہن ابھی جاگ رہے تھے۔ اشوک کہنے لگا، "کل نانی جی آئیں گی میں ان کے ساتھ گھر چلا جاؤں گا" میں نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں میں بالکل نہیں جانا چاہتی۔ مجھے جیل بہت اچھی لگتی ہے۔ مجھے یہاں بالکل گرمی نہیں لگتی۔ میں نہیں کہوں گی کہ یہاں کا کھانا اچھا نہیں ہے۔" میری باتیں سن کر اشوک بولا "تمہیں رہنا ہو تو رہو، میں تو جاؤں گا۔ اتنی گندی مچھروں والی جگہ ہم کیوں رہیں۔ ہم تو اپنے لاجپت رائے بھون جائیں گے۔"

بی بی جی کہنے لگیں اچھا اب تم لوگ سو جاؤ۔ صبح ماتا جی آئیں گی تو دیکھا جائے گا۔ یہ کہہ کر وہ زمین پر لیٹ گئیں اور انھوں نے بتی بجھا دی۔

گرمی کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اشوک اور میں دونوں کروٹیں

بدل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اشوک سو گیا اور میں بہت دیر تک یہی سوچتی رہی کہ مجھے یہاں سے جانا ہی پڑا تو بی بی جی اس کوٹھری میں اکیلی کیسے رہیں گی۔ یہ سوچ کر میں رونے لگی۔ روتے روتے مجھے نیند آگئی۔ پتہ نہیں کیا وقت ہوگا کہ ایک کوٹھری سے زور زور سے چیخنے کی آواز آئی۔ چیخیں سن کر سبھی کوٹھریوں کی عورتیں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پتہ چلا کہ ایک کوٹھری میں ایک بڑا سا کالا سانپ رینگ رہا تھا۔ شور سن کر پہرے پر لگی سبھی عورتیں آگئیں۔ سانپ تو خیر چلا گیا لیکن آنکھوں کی نیند بھی ساتھ لے گیا۔

جب صبح آنکھ کھلی تو کافی وقت بیت چکا تھا۔ بی بی جی نہا چکی تھیں اور بیٹھی ہوئی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ اشوک نے ان سے پوچھا۔ " کیا نانی جی آگئی ہیں" پھر کہنے لگا " میرا سامان ٹھیک کر دو۔ میں ان کے آتے ہی گھر چلا جاؤں گا "۔ اشوک خاموشی سے نانی جی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا اور میرا دل ڈر کے مارے بیٹھا جا رہا تھا۔ ہم دونوں بھائی بہن باہر جا کر نہائے اور واپس آکر کچھ کھایا۔ جو سامان ہم اپنی بیرکوں سے لائے تھے اس میں کچھ تلی ہوئی مونگ کی دال اور ریوڑی بھی تھی۔ وہی ہم کھانے لگے۔ ہم کپڑے بدل کر تیار ہو چکے تھے تبھی باہر سے آوازیں آئیں " بچوں کو لینے رشتہ دار آگئے ہیں "۔ میں ایک دم سے رونے لگی اور بی بی جی کے گلے سے لپٹ کر بولی، " مجھے مت بھیجو۔ میں آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گی۔ شاید بی بی جی بھی ہم دونوں کو ایک ساتھ باہر نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ اشوک کے کپڑے الگ سے بندھ چکے تھے۔ وہ باہر جانے کے لیے اتنا

خوش تھا کر بی بی جی سے بولا، اچھا میں جا رہا ہوں۔

بی بی جی نے مجھ سے کہا کہ تم باہر تک چھوڑ آؤ۔ اگر ماتا جی سے ملو تو دیتے اور سنتوش کا حال پوچھنا اور یہ بھی پوچھنا کہ بھوشن (ہمارے ماموں) کی شادی کب ہو رہی ہے۔ ایک پولیس کی عورت نے آکر اشوک کا سامان اٹھالیا اور ہم باہر آ گئے۔ میں نے دیکھا کہ بی بی جی کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں لیکن اشوک نے پلٹ کر ایک بار بھی بی بی جی کی طرف نہیں دیکھا۔ بس جاتے جاتے یہ بولا " میں جا رہا ہوں آپ بھی جلدی سے گھر آجانا۔"

جب ہم باہر کے بڑے پھاٹک پر پہنچے تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال نے آکر بچوں کے سارے سامان کی تلاشی لی۔ دوسرے سبھی بچے بھی واپس جا رہے تھے۔ اسے تلاشی لیتا دیکھ کر ممی بولی۔" دیکھ لو ایک ایک چیز دیکھ لو۔ ہم کوئی بم یہاں سے نہیں لے جا رہے ہیں۔"

یہ سن کر آس پاس کے سبھی لوگ ہنسنے لگے۔ تلاشی ختم ہوئی اور اور پھاٹک کے باہر ان بچوں کو بھیج دیا گیا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تم بھی جاؤ تمہارا سامان بعد میں آجائے گا۔

میں اندر کی طرف بھاگی۔ مجھے ڈر تھا اگر سنتوش اور نانی جی سے ملنے کے لالچ میں باہر گئی تو مجھے زبردستی باہر بھیج دیا جائے گا۔ میں نے دور سے کھڑے ہو کر پھاٹک سے لگی کھڑکی میں سے دیکھا کہ لاجپت رائے بھون کے بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سنتوش بھی نانی جی کے ساتھ آئی تھی۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ ہلایا۔ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی اس نے مجھے بلایا

لیکن میں باہر نہیں گئی۔ میں نے سنا سبھی بچے اونچی آوازوں میں اپنے رشتہ داروں کو بتا رہے تھے کہاں کی مائیں پھانسی کی کوٹھریوں میں قید ہیں۔

یہ سُن کر نہ جانے ہماری نانی جی اور دوسرے لوگوں کے دلوں پر کیا بیتی ہوگی۔ اشوک نانی جی کے ساتھ لپٹ گیا اور سنتوش سے باتیں کرنے لگا۔ کوئی دو منٹ بعد کھڑکی بند ہو گئی اور میں دوڑتی ہوئی واپس بی بی جی کے پاس آگئی مجھے یہ احساس ہوا کہ بی بی جی کو اس بات سے مایوسی ہوئی کہ نانی جی اور سنتوش سے میں باتیں نہیں کر سکی تھی۔

اگلے ہی دن سے ان کوٹھریوں میں بھی باقاعدگی سے زندگی شروع ہو گئی۔ دوسری عورتوں کی طرح بی بی جی صبح اٹھ کر چرخہ کاتتیں اور پھر کچھ کتابیں پڑھتیں۔ دوپہر کو تھوڑی دیر آرام ہوتا شام کو سبھی کوٹھریوں میں سے قومی ترانوں کی آوازیں آنی شروع ہو جاتیں۔ سبھی عورتیں ایک ساتھ گاتیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح باہر سڑکوں پر گیت گائے جاتے تھے اور نعرے لگائے جاتے تھے۔ گیتوں کے ساتھ نعروں کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا۔ یہ نعرے اس وقت زیادہ لگتے جب جیل سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ پر آتے۔ سیاسی قیدیوں کے جوش میں کسی طرح کی کمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

کھانا کھانے کا سلسلہ بھی اسی طرح چل رہا تھا۔ لیکن میں نے اس کی کبھی شکایت نہیں کی تھی۔ جو کچھ بھی ہوتا چپ چاپ کھا لیتی۔ دن میں باہر کھیلنے چلی جاتی تھی۔ کھیل بھی کیا تھے بس باہر جیل کی میٹرنوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتی۔ وہ مجھ سے میرے گھر کے متعلق پوچھتیں، یہ جاننا چاہتیں کہ میرے پتا جی

کہاں ہیں۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ میرے بابوجی بھی جیل میں ہیں تو ان میں سے ایک ہنس کر بولی "تو تمہارے ماں باپ کا پیشہ ہی جیل جانا ہے۔" مجھے اس کی باتیں سن کر بے حد غصہ آیا۔ میں رات بھر سوچتی کہ اگلے دن ملنے پر اس کا کیا جواب دوں گی۔

اگلے دن میں نے خود ہی جیل کی بات چھیڑی۔ وہ بولی تمہارے والدین جیل والے ہیں۔ میں تنک کر بولی "ایک دن انہی جیل والوں کی حکومت ہوگی۔ آزادی ملنے کے بعد تمام ٹوڈی جس میں جیل کے تمام سپرنٹنڈنٹ بھی شامل ہوں گے کو جیل بھیجا جائے گا۔" جیل کے تمام سپرٹوں نے میری بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ ویسے ہماری بی بی جی اور بابوجی ہمیں یہی بتاتے تھے کہ جیل میں کام کرنے والے لوگ تو بیچارے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے نوکری کرتے ہیں۔ یہ لوگ ٹوڈی نہیں ہیں۔ ٹوڈی وہ لوگ ہیں جو جنگِ آزادی میں لڑنے والوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہمیں اس بات کا یقین تھا کہ آزادی ملنے کے بعد ان تمام ٹوڈیوں کو سزا ملے گی اور انھیں وہی تکلیفیں دی جائیں گی جو انھوں نے آزادی کے لیے لڑنے والوں کو دی تھیں۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد لوگوں کو یہ دیکھ کر بھاری دکھ ہوا کہ وہی لوگ اونچے عہدوں پر بیٹھ گئے جو ٹوڈی سمجھے جاتے تھے۔ اور جنھوں نے وطن پرستوں کو بھاری تکلیفیں دی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ آزادی ملنے کے بہت سال بعد جب جنگِ آزادی میں لڑنے والے لوگوں کو پنشن دینے کا سوال اٹھا تو یہ کام ان ہی افسروں

کو سونپا گیا جنھوں نے ان دیش بھگتوں کو جیلوں میں ٹھونسا تھا۔ بہت سے ٹوڈی افسروں نے اس وقت ان کانگریسیوں سے کہا تھا "تم کانگریسی تو کھدر پہننے اور جیل جانے کی قیمت وصول کر رہے ہو۔" میں نے جنگ آزادی کے بہت سے سپاہیوں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔

جیل جانے کے سلسلے میں مجھے ایک اور قصہ بھی یاد آرہا ہے۔ لاہور جیل میں ایک دن میری ماں نے جیل کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال سے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب آپ جیل میں ہوں گی اور ہم آپ کو سزا دیں گے۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ آزادی ملنے کے صرف گیارہ سال بعد یعنی ۱۹۵۸ء میں جب ہماری ماں ستیادیوی نے پنجاب، ہماچل، ہریانہ اور جموں کشمیر کے ٹرانسپورٹ مزدوروں کی ایک فیڈریشن بنائی اور لدھیانہ میں ایک بڑی ٹرانسپورٹ کمپنی نے جب اپنے مزدوروں کو دھڑا دھڑ نوکری سے نکال دیا تب ہماری ماں نے جو اسی ٹرانسپورٹ فیڈریشن کی صدر تھیں، بہت سے دوسرے کارکنوں کے ساتھ مل کر اسی ٹرانسپورٹ کمپنی کے باہر دھرنا دیا تو ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالکوں نے پولیس کو بلوا کر ہماری ماں اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کروا دیا۔ بی بی جی کو لدھیانہ کی جیل میں لے جایا گیا۔ سارے لدھیانہ میں ہی نہیں، بلکہ سارے پنجاب میں شور ہو گیا کہ ایک کانگریسی ایم۔ ایل۔ اے کو گرفتار کیا گیا ہے۔ بہت سے اخباروں میں اس حادثہ کو لے کر خصوصی اداریے بھی لکھے گئے۔ جب ہماری ماں پولیس کی حراست میں

لدھیانہ جیل میں پہنچیں تو وہ پھولوں سے لدی ہوئی تھیں گرفتاری سے پہلے سیکڑوں ٹرانسپورٹ مزدوروں نے ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے تھے۔ جیل سپرنٹنڈنٹ ہماری بی بی جی کو دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی گلے سے لگایا اور بولیں "سیتا! تمہاری قسمت میں کیا جیل ہی لکھی ہے؟ تم تو کہا کرتی تھیں کہ آزادی ملنے کے بعد تم جیل نہیں جاؤ گی، لیکن لگتا ہے کہ تمہاری جدوجہد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی" لدھیانہ عورتوں کی جیل کی سپرنٹنڈنٹ وہی مسز لال تھیں جو ۴۳۔۱۹۴۲ء میں لاہور میں عورتوں کی جیل کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ رہ چکی تھیں۔ ہماری بی بی جی نے لدھیانہ کی جیل میں دو دن بتائے اور تب تک رہا ہونے پر راضی نہ ہوئیں جب تک تمام ٹرانسپورٹ ملازمین کو کمپنی میں واپس نہ لے لیا گیا۔ بعد میں برسوں تک مسز لال کا جالندھر میں ہمارے گھر آنا جانا رہا۔

واپس لاہور جیل کی طرف آئیے ابھی مشکل سے ایک ہفتہ بھی نہ بیتا ہوگا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ نے اطلاع دی کہ اب کوئی بھی بچہ اپنی ماں کے پاس جیل میں نہیں رہے گا۔ یہ سنتے ہی میں نے رونا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا کہ بی بی جی کے چہرے پر اُداسی تھی۔ بی بی جی نے مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا "اچھا ہے تم گھر میں اپنی بہنوں اور بھائی کے ساتھ کھیلنا یہ جیل تو بہت گندی جگہ ہے۔ یہاں کتنی گرمی ہے۔ رات کو مچھر کاٹتے ہیں اور کھانا بھی بہت خراب ملتا ہے۔"

میں ساری رات روتی رہی۔ بار بار بی بی جی سے یہی کہتی کہ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی۔ اگلے دن صبح گیارہ بجے جیل کی ہیڈ میٹرنوں

نے آکر کوٹھری کا دروازہ کھولا اور کہا کہ مجھے لینے کے لیے باہر نانی جی آگئی ہیں۔ میں بی بی جی کے گلے سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی "میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔" دونوں میٹرنیں مجھے کھینچ رہی تھیں میرا خیال تھا کہ وہ میرے بازو ماں کے گلے سے نہیں چھڑا سکیں گی۔ لیکن انھوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ مجھے الگ کیا اور گود میں اٹھالیا۔ میں روتی چلاتی باہر لائی گئی۔ باہر جاتے ہوئے میں نے جیل کی ہر چیز کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ مجھے وہاں کی ہر چیز سے اور ہر انسان سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ باہر نانی جی کھڑی تھیں انھوں نے مجھے اپنی گود میں لے کر پیار کیا۔ تب تک میرا سامان بھی آچکا تھا۔ میں اس قدر رو رہی تھی کہ میں نے سامان کی تلاشی کرنے والوں کو کچھ نہیں کہا۔ ہم ٹانگے میں بیٹھے۔ میری ہچکیاں ابھی تک بندھی ہوئی تھیں۔ جب تک تانگہ جیل کے پھاٹک کے سامنے کی سڑک پر چلتا رہا، میں ٹکٹکی باندھے ادھر ہی دیکھتی رہی۔ میں نے اپنی پیاری نانی سے بھی کوئی بات نہیں کی۔ پھر موڑ آیا اور بڑا سا کالا پھاٹک میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گھر آنے کے بعد بہت دن میں اداس رہی لیکن سنتوش خوش تھی کیونکہ میرے جیل میں رہنے سے وہ بالکل اکیلی ہو گئی تھی۔ میں اپنی نانی جی دادی اور سنتوش کو اکثر جیل کی باتیں سناتی۔

سہگل — ڈھلّوں — شاہنواز

لاجپت رائے بھون میں بہت چہل پہل تھی۔ ڈھیروں لوگ وہاں کے برآمدوں میں چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ لاجپت رائے بھون کے ہال کے پاس کے کمرے جو سرونٹ آف پیپلز سوسائٹی کے دفتر تھے، خالی کر دیئے گئے تھے۔ ہم بچے بہت خوش تھے جب ہمیں پتہ چلا کہ آزاد ہند فوج کے لوگ لاجپت رائے بھون کے ہال میں اپنے ڈرامے پیش کریں گے۔ ان ڈراموں میں آزاد ہند فوج کی تنظیم اور جدوجہد کی کہانی پیش کی جائے گی۔

ان دنوں سارے ماحول میں آزاد ہند فوج، نیتاجی سبھاش چندر بوس اور ان کے تین بہادر جوانوں سہگل، ڈھلّوں اور شاہنواز کا نام گونج رہا تھا۔ انگریز سرکار نے دلّی کے لال قلعہ میں آزاد ہند فوج کے ان تین بہادروں پر مقدمہ شروع کر رکھا تھا۔ ہر آزادی پسند ہندستانی کی نظریں لال قلعہ پر لگی ہوئی تھیں۔ ان دنوں ہم اس مقدمہ کی باریکیوں سے تو واقف

نہ تھے لیکن اتنا ضرور جانتے تھے کہ ماحول میں اتنی گرمی اور تناؤ تھا کہ اگر سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز کا فوری طور پر فیصلہ نہ ہوا تو انگریز حکومت کے خلاف انقلاب کی چنگاریاں شعلہ بن کر پھوٹ پڑیں گی۔ ہم اکثر یہی بات سنتے کہ لال قلعہ میں انقلاب کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور کسی وقت بھی جوالا مکھی پھوٹ سکتا ہے۔ ہم بچے بھی ان دنوں یہی نعرے لگاتے تھے:

"لال قلعہ سے آئی آواز

سہگل، ڈھلوں، شاہنواز"

سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز تینوں ہماری نظر میں بہت بڑے لیڈر اور ہیرو تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ کسی طرح ان کی ایک جھلک ہمیں دیکھنے کو مل جائے۔ جس دن ہمیں یہ خبر ملی کہ سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز آزاد کر دیے گئے ہیں اور انگریز سرکار نے ان کے خلاف چلتے ہوئے مقدمے میں اپنی ہار مان لی ہے، تو سارے لاجپت رائے بھون میں خوشی پھیل گئی۔ ہم نے اس دن خوشی کے دیے جلائے۔ ہم بچے اتنے خوش تھے جیسے عید یا دیوالی جیسا بڑا کوئی تہوار ہو۔ ہمارے پانو خوشی سے زمین پر نہیں پڑتے تھے۔ ہمیں یہی احساس ہو رہا تھا کہ یہ تینوں ہمارے بہت قریبی رشتہ دار ہیں، جو پھانسی کے پھندے سے آزاد ہو کر آئے ہیں۔

پنجابی کی مشہور گیت کار شیلا بھاٹیہ کا لکھا ہوا ایک گانا ہم بچے ان دنوں ہر وقت گایا کرتے تھے۔

"اِکّے دی واج دِتا   لال قلا توڑ دے
اِکّے دی واج توں کیہ   انگریزی ساماراجیہ اوئے
اِکّے دی واج اڑی جو   ایسا لال کریا
سہگل، ڈھلوں تے شاہنواز نوں بچا لیا"

سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز آزاد ہو چکے تھے۔ دلّی سے وہ لاہور آنے والے تھے۔ لاہور میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔ چاروں طرف خوشی اور جوش کا جذبہ تھا۔ جس دن انہیں لاہور پہنچنا تھا، اس دن صبح سویرے سے ہی اسٹیشن کے آس پاس لوگوں کی میلوں لمبی بھیڑ جمع ہو چکی تھی۔ کہیں بھی پانو رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہم بچے صبح چار بجے ہی اسٹیشن جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ رات بھر خوشی کے مارے نیند نہیں آئی۔ اس دن تو ہمیں بیساکھی کے میلے میں جانے سے بھی زیادہ جوش اور خوشی تھی۔ ہم رات بھر یہی سوچتے رہے تھے کہ کب ہم سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز کو دیکھیں گے۔

لاجپت رائے بھون میں رہنے والے بچوں میں اکثر یہ بحث چھڑی رہتی تھی کہ سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز کا درجہ دوسرے کانگریسی لیڈروں کے مقابلے میں کتنا اونچا ہے۔ پڑھنے والوں کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اس وقت کے سیاسی ماحول میں پلنے والے ہم چھوٹے بچے بھی یہ بحث کر سکتے تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے تشدد کا راستہ ٹھیک ہے یا گاندھی جی کا بتایا ہوا راستہ ٹھیک ہے۔ ہم بچے آزاد ہند فوج، نیتاجی سبھاش چندر

بوس اور دوسرے انقلابیوں کے دیوانے تھے ۔ ہماری نظر میں ہندوستان کی آزادی کے ہیرو یہی انقلابی ہی تھے ۔ ہم بچے گاندھی جی کی بہت عزت کرتے تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں لاہور میں گاندھی جی سے ملنے گئی تھی تو اُن کی بات چیت کرنے کے سیدھے سادے اور پیارے انداز میں مجھے اور میری بہن سنتوکش کو متاثر تو کیا ہی تھا لیکن اس وقت بھی ہم دونوں بہنوں نے آپس میں یہ بحث ضرور کی تھی کہ ہندوستان کو آزادی محض گاندھی جی کے امن کے نعروں سے نہیں مل سکتی ۔ ہمیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ اگر بھگت سنگھ سکھ دیو، راج گرو اور چندر شیکھر آزاد جیسے سیکڑوں شہید اور انقلابی اپنی جان کی قربانی نہ دیتے ، اگر انگریزوں کو انقلابی اپنے بموں سے اور دوسری انقلابی کارروائیوں سے نہ ڈراتے تو جنگ آزادی کی مہم اتنی تیز نہ ہوتی اور شاید ہندوستان کو ۱۹۴۷ء میں آزادی نہیں ملتی ۔

ویسے بھی خود ہمارے اپنے گھر میں ہماری بی بی جی اور بابو جی کے درمیان گاندھی واد اور انقلابیوں کی کارروائیوں کو لے کر اکثر بحث ہوتی رہتی تھی ۔ ہمارے بابو جی ہمیشہ یہی کہتے کہ چرخہ کاتتے رہنے سے انگریز ہندوستان نہیں چھوڑیں گے ۔ انگریزی سامراج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہماری دھماکوں کا ہونا لازمی ہے ۔ ہمارے بابو جی ہمیشہ یہی بات دہراتے کہ بہروں کو سنائی دینے کے لیے دھماکہ کرنا بہت ضروری ہے ۔ ہمارے بابو جی ہمیں بتاتے تھے کہ بھگت سنگھ کے ساتھ ان کی اکثر یہی بات ہوتی تھی کہ جب تک ہندوستان میں انقلابی اپنی طاقت نہیں دکھلائیں گے ، انگریز

ہندوستان چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ انگریز کبھی بھی ایک تھالی میں آزادی سجا کر ہندوستانیوں کو پیش نہیں کریں گے۔

شہید بھگت سنگھ کی ماں ودیا وتی، بہن امرکور اور بھائی کلتار اور کلبیر اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ بی بی امرکور تو ہماری ماں کی بہت اچھی دوست تھیں۔ ہم بچے بھگت سنگھ کے خاندان کی بہت عزت کرتے تھے۔ میں نے کئی بار بھگت سنگھ کی ماں سے اس کے بچپن کی بہت سی باتیں سنی تھیں۔ جب بھی وہ اپنے بیٹے کے متعلق باتیں کرتیں تو ہمیشہ ان کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ کہتی تھیں "میرا بھگت دنیا کا سب سے خوبصورت نوجوان تھا" ماتا جی ہمیں اکثر یہ بتاتیں کہ کس طرح بھگت سنگھ بچپن ہی سے بہادر اور نڈر تھا اور اپنی جان پر کھیل جاتے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ جب وہ بڑا ہوا تو اس کی ماں نے جب بھی اس کی شادی کی بات چلائی تو اس نے ہنس کر یہی جواب دیا "دیکھنا بی بی میں ایسی دلھن لاؤں گا جو دنیا میں سب سے انوکھی ہوگی" اور جب پھانسی کی کوٹھری میں بھگت سنگھ کی ماں اس سے ملنے گئی تو اس نے ہنستے ہوئے یہی کہا تھا "تم روتی کیوں ہو۔ تم تو ہمیشہ دلہن لانے کے لیے کہتی تھیں۔ اب میں آزادی کی دلہن لا رہا ہوں اور تم رو رہی ہو؟"

اس طرح کے ایک نہیں بہت سارے قصے بھگت سنگھ کی ماں ہمیں سنایا کرتی تھیں۔ بعد میں جب ۱۹۶۰ء میں شریمتی ودیا وتی جالندھر کے سول اسپتال میں بیہوشی کی حالت میں پڑی تھیں اور پنجاب سرکار نے

انھیں پنجاب ماتا کا خطاب دیا تھا اور پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے انھیں ایک ایمبیسیڈر کار بھی پیش کی تھی' تب ان کے پاس بیٹھے ان کے بیٹے کُلتار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پنجاب ماتا بیہوش تھیں اور کچھ عرصہ بعد انھوں نے وہیں اسپتال میں دم توڑ دیا۔ ہم سب کو یہ احساس تھا کہ بھگت سنگھ ہمارا اپنا کوئی سگا رشتہ دار ہے کیونکہ ہمارے بابوجی جب بھی بھگت سنگھ کی باتیں کرتے ان کا گلا کیھ آتا۔ آج بار بار یہی خیال آتا ہے کہ اگر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی زندہ ہوتے تو ملک کے موجودہ حالات کو دیکھ کر کیا سوچتے ؟

شاید ہم ننھے بچے بھی آزاد ہندوستان کا وہی تصور کر رہے تھے جو شہید بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ آزادی ملنے کے کچھ سال بعد بھگت سنگھ کی ماں نے یہی کہا تھا: "کتنا خوش قسمت تھا میرا بیٹا جو شہید ہو گیا۔ بد قسمت تو ہم ہیں جو ملک کا یہ حال دیکھ رہے ہیں" مجھے لگا کہ شہید بھگت سنگھ کی ماں یہ سوچتی ہوں گی کہ کیا اسی آزاد ہندوستان کے لیے ان کے بچے نے قربانی دی تھی؟ نہ جانے کتنے بھگت سنگھوں کی مائیں یہی سوچتی ہوں گی۔

ان دنوں ہم بچوں کے سامنے آزادی کی ایک بڑی ہیروئن ارونا آصف علی تھیں۔ ہم ہر وقت ان کے انقلابی کارناموں کے قصے سنتے اور پڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار ارونا جی جب لاہور آئیں تو ہم نے بہت ضد کی کہ ہم جا کر ارونا آصف علی کو دیکھیں گے اور ان سے بات چیت

کریں گے۔

ہمارے پاس ارونا آصف علی کی ڈھیروں تصویریں تھیں۔ ہم نے بہت سے لوگوں سے یہی سنا تھا کہ نوجوان ارونا نے انگریزی سامراج کو ہلا کر رکھ دیا ہے اور اگر ہندوستان میں ارونا آصف علی جیسی پچاس عورتیں ہو جائیں تو ملک کو فوراً آزادی مل جائے۔ مجھے یاد ہے کہ جس دن پہلی بار ارونا آصف علی کو دیکھا تو مجھ میں ٹھیک اسی طرح جوش کا جذبہ تھا جیسے آج کے بچے اپنی کسی مقبول فلمی ہیروئن کو دیکھ کر محسوس کرتے ہیں۔ پتلی دبلی لیکن بیحد دلکش شکل و صورت کی ارونا کو دیکھ کر یہ احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر انقلاب کی جوالا مکھی بھری ہوئی تھی۔ میں ایک ٹک ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور جب وہ مسکرائیں تو کچھ اور ہی زیادہ خوبصورت، لیکن طاقتور نظر آئیں۔

آج مسز ارونا آصف علی کے چہرے پر مجھے وہی مسکراہٹ اور ملک کے لیے پیار کا جذبہ دکھائی دیتا ہے۔ سیاسی بھیڑ اور ہلچل سے دور ارونا آصف علی آج بھی چپ چاپ اپنے کام میں لگی ہوئی ہیں۔ انھوں نے شہرت کے پیچھے بھاگنے کی بھی کوشش نہیں کی۔

ہاں تو میں ذکر کر رہی تھی سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز کے لاہور آنے کا۔ آج تک اتنی بھیڑ نہیں دیکھی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اتنی بھیڑ تو لاہور میں اس وقت بھی جمع نہ ہوئی تھی جب مشہور فلم ایکٹر اشوک کمار ان دنوں کی مقبول ایکٹرس لیلا چٹنس کے ساتھ لاہور کے اسٹیشن پر اترے

تھے۔ میں نے اشوک کمار اور لیلا چٹنس کے دیوانوں کی بھیڑ تو نہیں دیکھی، لیکن آزاد ہند فوج کے ان بہادروں کے خیر مقدم کے لیے اتنی بڑی بھیڑ شاید آج تک کسی ریلوے اسٹیشن پر جمع نہ ہوئی ہوگی۔

وہ دیکھنے کا منظر تھا۔ صبح سے ہی ہزاروں لوگوں کی بھیڑ اسٹیشن کی طرف اُمنڈتی چلی جا رہی تھی۔ ہم بچے بھی اپنی ماں کے ساتھ اس بھیڑ کو کاٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بی بی جی کو ڈر تھا کہ اس بھیڑ میں کہیں ہم کھو نہ جائیں۔ اُدھر ہمیں بس ایک ہی لگن تھی اور وہ یہ کہ جلدی سے جلد اسٹیشن پہنچ جائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں دیر ہو جائے اور گاڑی آجائے۔

دور ہی سے جب گاڑی آتے دکھائی دی تو سارے ماحول میں نعروں کی آواز گونج اٹھی۔ لگتا تھا کہ ان نعروں کی آوازوں سے آسمان پھٹ جائے گا۔ گاڑی رکی، دروازہ کھلا، سب سے پہلے کیپٹن سہگل کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس کے بعد کرنل ڈھلوں اور میجر جنرل شاہنواز باہر نکلے۔ یہ تینوں شکلیں ہندوستان کی جنگ آزادی کی زندہ تصویر دکھائی دے رہی تھیں۔ سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز اس بات کا ثبوت تھے کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو، سکھ اور مسلمانوں نے کس طرح ایک ہو کر قربانی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ سہگل، ڈھلوں اور شاہنواز کا خیر مقدم کرنے والوں میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی تعداد برابر کی تھی۔

ان دنوں اگر کوئی مذہب کی بات کرتا تو ہمیں عجیب اور بُرا سا معلوم ہوتا۔

ہمارے گھر میں ہماری دادی اگر کسی کارکن کے متعلق یہ سوال پوچھتیں کہ کیا وہ

عیسائی یا مسلمان ہے تو ہم بچے طوفان کھڑا کر دیتے اور چیخ چیخ کر یہی کہتے کہ وہ ہندوستانی ہے اور کچھ بھی نہیں۔

ہم بچے اپنے گھر میں آنے والی کانگریسی اور دوسری خواتین کارکنوں کو ہمیشہ چچی یا خالہ کہا کرتے تھے اور ہر مرد یا تو ہمارا ماموں ہوتا یا چچا۔ بات محض چچا، چچی، خالہ یا ماموں کہنے کی نہیں تھی، بلکہ ان دنوں جنگ آزادی میں الجھے لوگ خود کو ایک بڑے خاندان کا حصہ سمجھتے تھے اور ہر وقت ہمیں یہی احساس رہتا تھا کہ یہ ہمارے قریبی رشتہ دار ہیں۔ آپس میں کسی طرح کے گلے شکوے یا جھگڑے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

ہماری دادی اکثر یہی شکایت کرتی تھیں کہ ہمارے گھر میں تو کسی کو دھرم کا خیال ہی نہیں ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہر یجن سبھی ایک باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ ان دنوں گھروں میں تھالیوں اور کٹوروں میں کھانا کھایا جاتا تھا۔ ہماری دادی بار بار کہتیں کہ اگر ہر ایک کو ایک ساتھ کھانا کھانا ہے تو پلیٹوں میں کھاؤ، پیتل کی تھالیوں میں نہیں، کیونکہ ہماری دادی کو یہ وہم تھا کہ پیتل کی تھالیاں جھوٹی ہو جاتی ہیں۔ ہمارے گھر میں اکثر اسی بات کو لے کر ہمارے بابوجی اور بی بی جی کے درمیان جھڑپ بھی ہو جاتی تھی۔ ہماری دادی بڑبڑاتی رہتیں کہ اس گھر میں تو کوئی دین مذہب نہیں رہ گیا ہے۔ ہر مذہب کا آدمی یہاں آ کر ہماری تھالیوں میں کھانا کھاتا ہے لیکن بابوجی کے غصے کے آگے ہماری دادی کو چپ رہنا پڑتا اور ان کی ایک نہ چلتی۔

اسٹیشن پر آزاد ہند فوج کے ان تینوں بہادروں کا تلک ایک نوجوان عورت نے اپنا انگوٹھا چیر کر اپنے خون سے کیا۔ سہگل، ڈھلّوں اور شاہنواز کے گلے میں پھولوں کے اتنے ہار پہنائے گئے کہ وہ تینوں پھولوں کے ڈھیر نظر آنے لگے۔ ایک طرف پھولوں کے ہار پڑ رہے تھے تو دوسری طرف نعروں کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔

اس دن کے بعد کئی بار مجھے آزاد ہند فوج کے ان تینوں بہادروں سہگل، ڈھلّوں اور شاہنواز سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔ جب مرحوم شاہنواز خاں دلّی میں مرکزی وزیر تھے تو ان سے کئی بار بات چیت ہوئی، لیکن ان ملاقاتوں میں مجھے ان کے چہرے اور آنکھوں میں ویسی رونق اور چمک کبھی دکھائی نہیں دی جو میں نے لاہور اسٹیشن پر اُنتالیس برس پہلے دیکھی تھی۔

کیا وجہ ہے کہ ہماری سرکار جنتا کے اس جوش کا کچھ حصہ بھی قائم نہیں رکھ پائی۔ ان سینتیس[۳۷] برسوں میں ہم نے مایوسی اور بیزاری کے نہ جانے کتنے بڑے راستے کو طے کیا ہے۔ آخر اس کی ذمہ داری کس پر ہے؟ آج ہم اپنے بچوں اور نوجوانوں کے متعلق یہی شکایت کرتے ہیں کہ ان میں وطن پرستی کا جذبہ نہیں ہے۔ سینما گھروں میں ہم لوگ اپنے قومی ترانے کی عزت نہیں کرتے تھے اس لیے سینما شو کے ختم ہونے کے بعد اسے بجانا بھی بند کر دیا گیا۔ کیا ہمارے ملک کی نئی نسل اس کے لیے ذمہ دار ہے؟

دنیا کے ہر نئے آزاد ملک میں حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ جنتا کے جوش کو وقت کے ساتھ پیدا کرے اور وقت کے مطابق

ڈھاتی جائے۔ نوجوانوں کے سامنے لگاتار نئے آدرش رکھے جائیں، تبھی ان میں کسی طرح کے جوش کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لوگوں میں یہ احساس پیدا کرنا ضروری ہے کہ آزادی کی جنگ تو ختم ہو گئی لیکن ملک کی تعمیر کی جدوجہد جاری ہے۔ لیکن آج لگتا ہے کہ ہم اپنے ماضی کو یا تو بھول چکے ہیں یا اس سے شرمسار ہیں اور اس پر فخر کرتے ہوئے ہمیں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے۔

جب سرکار کو ہمیشہ یہ خوف پریشان کرتا رہے کہ ہماری کسی بات سے انگریز صاحب ناراض نہ ہو جائیں اور ان کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے تو ملک میں جوش کے جذبے کو کس طرح برقرار رکھا جا سکتا ہے؟ جب ہمارے ملک میں اس برٹش وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی فلم کی تیاری کے دوران ہمارے بڑے نیتا فلم یونٹ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں، جس ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی تقسیم کروائی تھی، جس نے ہر قومی لیڈر کی شان میں بُری باتیں کہی تھیں اور جو بہت حد تک تقسیم کے دوران ہونے والے خون خرابے کا ذمہ دار تھا۔ یا تو ہم ماؤنٹ بیٹن کے مرنے پر سات دن کا مکمل سوگ منا سکتے ہیں یا اپنے نوجوانوں کے دلوں میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ کچھ سال پہلے میں نے بھگت سنگھ پر بنائی گئی ایک ڈاکومنٹری فلم دیکھی تھی۔ اس میں ایک بار بھی برٹش سامراج واد، نہیں کہا گیا۔ بار بار صرف بدیشی سامراج کہا جاتا تھا۔ جب ہم اپنے شہیدوں کے قاتلوں کو قاتل

کہنے کی ہمت نہیں رکھتے تو ہمیں اس بات پر آنسو بہانے اور شکایت کرنے کا کوئی بھی حق نہیں ہے کہ ہمارے نوجوان ملک پر قربان ہونے والوں شہیدوں اور جنگ آزادی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

بابا اور فریڈا بیدی

لاجپت رائے بھون کی زندگی اور سیاسی چہل پہل کا بیان کچھ لوگوں کا ذکر کیے بغیر ادھورا رہے گا۔ ان لوگوں میں سے سب سے پہلے میرے ذہن میں نام آتے ہیں بابا پیارے لال بیدی اور ان کی انگریز بیوی فریڈا بیدی کے۔ ہم بچوں کے لیے یہ دونوں بہت بڑے ہیرو تھے ان کے آس پاس ہم نے بہت خوبصورت اور رومانی جال بنا رکھا تھا۔ چھ فٹ دو انچ لمبے بیدی صاحب جنھیں ہم نے ہمیشہ موٹے کھادی کے شلوار کرتے اور موٹی پشاوری چپل میں دیکھا تھا، ہمارے بابوجی کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے۔ فریڈاجی سے زیادہ خوبصورت اور رعب دار شخصیت کی انگریز عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ بیدی صاحب اس زمانے سے ہمارے بابوجی کے قریبی دوست تھے جب ان کے ساتھ اور مشہور اکونومسٹ پروفیسر برج نارائن کے ساتھ مل کر آن کسان اسکولوں کو چلایا تھا جن کا مقصد گاؤں میں گھوم گھوم کر عام کسانوں کو سیاسی

تعلیم دیتا تھا۔

بیدی صاحب اور پروفیسر برج نارائن اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے اور سیاسی بحث کے دوران میری ماں کے ہاتھ کی بنی طرح طرح کی مٹھائیاں کھاتے جاتے اور زوروں سے قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ہماری ماں بہت اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ سیاسی کاموں میں مصروف رہنے کے باوجود انہیں ہر طرح کی مٹھائیاں بنانے کا بہت شوق تھا۔ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ طرح طرح کی مٹھائیاں ہمارے لیے بناتیں۔ سردیوں میں ان کے ہاتھ کا بنا گاجر کا حلوہ اور بیسن کے لڈّو ہم لوگ بہت شوق سے کھاتے تھے۔ یہ تمام مٹھائیاں ہمارے گھر آنے والے باوجی کے دوستوں کو بھی کھلائی جاتی تھیں۔ پروفیسر برج نارائن جو خود کنوارے تھے، جب ہمارے گھر آکر یہ مٹھائیاں کھاتے تو ہمارے باوجی سے یہی کہتے "بھئی اگر تم مجھے یہ گارنٹی دلا دو کہ مجھے سیتا جیسی بیوی مل سکتی ہے جو، جوشیلی سیاسی کارکن بھی ہو اور اتنی بڑھیا مٹھائی بنانے والی بھی، تو میں فوراً شادی کر لوں گا۔"

پروفیسر برج نارائن نے شادی تو نہیں کی، لیکن ان جیسے ترقی پسند انسان کو بھی فرقہ وارانہ جنون کا شکار ہونا پڑا اور جب ۱۹۴۷ء میں لاہور میں فرقہ واریت کے شعلے بھڑکے تو پروفیسر برج نارائن ایک پاگل کے چھرے کا شکار ہو گئے۔ ان کا خون ہندوستانی تاریخ پر ہمیشہ ایک بھاری اور بدصورت دھبے کی صورت میں موجود رہے گا۔

مجھے یاد ہے کہ بیدی صاحب اور فریڈا بیدی جنھیں گھر میں سبھی

لوگ اور قریبی دوست پیار سے اُگی کہتے تھے، اکثر سائیکل پر لاجپت رائے
بھون آتے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ جب بیدی صاحب نے لندن سے اپنی والدہ
کو اپنے ساتھ پڑھنے والی فریڈا کے بارے میں لکھا تھا اور شادی کی
اجازت مانگی تھی تو انھوں نے پیار سے اپنے بیٹے سے یہ پوچھا تھا "یہ
فریڈا کہاں سے اُگی ہے؟" تبھی سے فریڈا جی کا نام اُگی پڑ گیا تھا۔ فریڈا
جی کھادی کا شلوار کرتا اور دوپٹہ پہنتیں۔ ان کے بال ریشم کے دھاگوں
سے بھی نرم تھے۔ جب وہ اپنا جوڑا بناتیں تو اکثر ڈھیلا ہو کر کھل جاتا بیدی
صاحب اور فریڈا جی لاجپت رائے بھون سے دس میل دور ماڈل ٹاؤن
میں رہتے تھے جہاں انھوں نے اپنے رہنے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر
کے کنارے، گھنے پیڑوں کی چھانو میں مٹی اور پھوس کی جھگیاں بنا رکھی تھیں۔
ان دنوں لاہور سے ماڈل ٹاؤن کا راستہ بہت لمبا پڑتا تھا کیونکہ ہم چھوٹے
بچے سائیکل نہیں چلا پاتے تھے۔ یہ راستہ یا تو ٹانگے سے طے کرنا
پڑتا تھا، یا بس سے۔

لیکن جب کبھی اپنے بابوجی کے ساتھ ہم بیدی صاحب کی ان
جھگیوں میں گئے تو ہمیں یہی احساس ہوا کہ یہ جگہ لاہور میں نہیں ہے بلکہ دور
کسی گانو میں ہے۔ کچھ تو ان جھگیوں اور گھنے پیڑوں کا اپنا ایک قدرتی
ماحول تھا اور کچھ وہاں پر رہنے والے لوگوں نے اپنی شخصیت سے ان
جھگیوں کو سادگی، خوبصورتی اور ایک نئے قسم کی جاذبیت اور کشش
بخش دی تھی۔

یہیں پہلی بار میں نے بیدی صاحب اور فریڈا جی کے بیٹے رنگا کو دیکھا۔ ماڈل ٹاؤن کی ان جھگیوں میں تو ہم رنگا کے ساتھ نہیں کھیل پائے، لیکن بیدی صاحب نے اسی طرح کی جھگیاں ضلع کانگڑہ میں پالم پور کے قریب اندھریٹا میں بنا رکھی تھی، جہاں ہم کئی بار جاکر ٹھہرے تھے۔ رنگا عمر میں مجھ سے چار سال بڑا ہوگا ہم مل کر خوب کھیلتے تھے۔ ہمیں یہ بہت اچھا لگتا کہ اتنا پیارا انگریز بچہ ہم سے کہیں بہتر پنجابی بولتا تھا۔ بیدی صاحب نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ اپنے بچوں کے ساتھ بات، چیت پنجابی ہی میں کریں گے۔

بیدی صاحب اور فریڈا جی ہمارے خاندان کا ایک ایسا حصّہ تھے کہ ہم نے انھیں ہمیشہ اپنا قریبی رشتہ دار سمجھا۔ اس وقت میں نے یہ تصوّر بھی نہ کیا تھا کہ بڑے ہونے پر میری شادی بیدی صاحب کے خاندان میں ہوگی اور بیدی صاحب اور فریڈا جی سچ مچ میرے قریبی رشتہ دار بن جائیں گے۔ میرے شوہر دیوان بریندر ناتھ نے اپنا سارا بچپن بیدی صاحب اور فریڈا جی کے ساتھ بتایا ہے۔ بیدی صاحب کی والدہ جنھیں سب بھابوجی کہتے تھے، میرے شوہر کی پھوپھی تھیں۔ جب وہ مشکل سے چھ مہینے کا دودھ پیتا بچہ تھے تبھی ان کی ماں ہربنس کور کا انتقال ہوگیا اور ان کی پھوپھی پھول کور نے انھیں اپنی گود لے لیا تھا یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب بیدی صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات انقلابی ذہن کی انگریز لڑکی فریڈا سے ہوئی۔ لندن میں دونوں کی شادی ہوگئی۔ ان کے بیٹے رنگا کی پیدائش جرمنی میں ہوئی۔ جب بیدی

صاحب اور فریڈا جی ننھے رنگا کو لے کر ہندوستان آئے تو اس وقت بیریندر تین سال کے تھے، یعنی رنگا سے دو سال بڑے۔ فریڈا جی نے فوراً بیریندر کو جو رشتے میں ان کا دیور تھا، اپنا بیٹا کہا اور ۲۹ مارچ ۱۹۷۷ء میں جب ان کا انتقال ہوا تب تک بیریندر اور اپنے دونوں بیٹوں رنگا اور کبیر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہونے دیا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ میرے تین بیٹے ہیں بیریندر، رنگا اور کبیر اور ایک بیٹی گل ہما۔

رنگا جس کا پورا نام رنگا ترلوک چند بیدی ہے آج کل بنگلور میں چائے سکھانے کی مشینیں بنانے کا کارخانہ چلا رہا ہے۔ کبیر بیدی جس نے پہلے طالب علم کی شکل میں : ٹی ٹیلی ویژن اور تھیٹر کے حلقے میں ایک اعلیٰ درجے کے ایکٹر کی شکل میں شہرت حاصل کی، بعد میں ہندی فلموں میں بھی کام کرنے لگے۔

لیکن انہیں سب سے زیادہ شہرت اٹلی میں اپنی ٹیلی ویژن سیریل فلم سندوکن سے ملی۔ اس فلم نے اٹلی کے نوجوانوں کو کبیر بیدی کا متوالا بنا دیا۔ اس کے بعد کبیر بیدی نے چند ہالی ووڈ فلموں میں بھی کام کیا۔ آج کل وہ لاس اینجلس میں رہتے ہیں اور وہ اپنی فلمیں بھی بنا رہے ہیں۔ کبیر بیدی اکثر اپنی امریکن بیوی سوزن اور بیٹے ایڈم کے ساتھ ہندوستان آتے رہتے ہیں۔ بیدی صاحب کی بیٹی گل ہما اپنے شوہر شکتی میرا اور اپنے دو بچوں کے ساتھ امریکہ میں رہتی ہے۔

جن دنوں بیدی صاحب اور فریڈا جی سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی

تھی تو اس وقت کبیر اور ان کی بیٹی گل ہما پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ بیدی صاحب کے بارے میں یہی افسانے سننے میں آتے تھے کہ ان کی والدہ کپور تھلہ ریاست کے وزیر اعلیٰ اور چیف جسٹس دیوان ہرکشن داس کی بیٹی تھیں جو بہت ناز نخروں سے پلی تھیں اور ان کی شادی ڈیرا بابا نانک کے مشہور بیدی خاندان میں ہوئی تھی۔ بیدی صاحب کے والد کا انتقال تبھی ہو گیا تھا جب بیدی صاحب اور اُن کے بڑے بھائی ترلوچن داس بیدی بہت چھوٹی عمر کے تھے۔ ان کی ماں نے دونوں بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی اور دونوں کو پڑھنے کے لیے ولایت بھیجا تھا۔ بڑا بیٹا ترلوچن داس ی.ج.و بنا اور دوسرا ایک انقلابی۔ جب ترلوچن داس بیدی کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ سیشن جج تھے۔

ان دنوں کسی انگریز کے لیے برٹش سامراج کو چنوتی دینا کوئی معمولی بات نہیں تھی اس لیے جب فریڈا جی گرفتار ہوئیں تو سارے پنجاب اور سارے ہندوستان میں سنسنی پھیل گئی ایک انگریز نوجوان لڑکی ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے برٹش جیل میں قید تھی۔ ہماری ماں بتاتی تھیں کہ جب فریڈا جی لاہور جیل میں آئی تھیں تو وہاں کتنا تہلکہ مچا تھا۔ ہماری بی بی جی اور فریڈا جی جیل میں ایک ساتھ رہی تھیں اور وہیں سے دوستی کا آغاز بھی ہوا تھا۔ اس سے بڑا اتفاق اور کیا ہوگا کہ میری والدہ سیتا دیوی اور فریڈا بیدی جنھیں ہم نے ہمیشہ اپنی ساس ماں اور امی بتایا کرتی تھیں کہ یہ دوستی جیل کی کوٹھری سے شروع ہوئی تھی۔

لاہور کے لاجپت رائے بھون میں جب ہماری دادی مولی کے

گرم گرم پراٹھے پکاتیں تو بیاری صاحب اور فریڈا جی انھیں بہت شوق سے دہی اور لسّی کے ساتھ کھاتے۔ فریڈا جی کو ہمیشہ سے اچھے پراٹھے کھانے کا شوق تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۷ء میں اپنے انتقال سے پہلے جب جا بھی ہمارے گھر آکر ٹھہریں انھوں نے اسی طرح کے پراٹھے کھانے کی خواہش ظاہر کی۔ پچھلے کافی برسوں سے فریڈا جی نے بدھ مذہب اپنا لیا تھا اور بدھ راہبہ بن گئی تھیں۔ اسی حیثیت میں انھوں نے دنیا بھر کے ملکوں کا دورہ کیا اور بدھ راہبہ کے روپ میں انہیں بین الاقوامی اعزاز بھی ملا۔

آج بھی میری آنکھوں کے سامنے سناتم دھرم ہائی اسکول کا وہ گیٹ گھوم رہا ہے جہاں ۱۹۴۴ء میں بھاری بھیڑ جمع تھی۔ لاہور میں سناتن دھرم ہائی اسکول ٹھیک لاجپت رائے بھون کے ہال کے گیٹ کے سامنے تھا۔ ہم بچے بہت خوش تھے کیونکہ الکشن کی مہم چل رہی تھی اور چاروں طرف نعروں کا بول بالا تھا۔ الکشن میں ہندو مہا سبھا نے تیل کے تاجر بیلی رام کو کھڑا کیا تھا۔ ان کا مقابلہ کانگریس کے امیدوار لالہ کیدار ناتھ سہگل سے تھا جو اس وقت بھی جیل میں تھے۔ لالہ کیدار ناتھ سہگل نے یہ قسم کھائی تھی کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا وہ کالے کپڑے پہنیں گے۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد بھی وہ جتنے سال تک زندہ رہے، کھادی کے کالے کپڑے ہی پہنتے رہے۔ وہ ہمارے بابو جی کے اچھے دوست تھے اور اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔ جب بھی وہ جالندھر میں ہمارے گھر آتے اور ہم کہتے کہ چچا اب تو کالے کپڑے اتار دو تو وہ ہمیشہ ہنس کر جواب دیتے

"کیا سچ مچ ہندوستان آزاد ہو گیا؟ میں تو تبھی کالے کپڑے اتاروں گا جب سچ مچ ہندوستان آزاد ہو گا۔" لالہ کیدار ناتھ سہگل کا انھیں کالے کپڑوں میں انتقال ہو گیا۔

میں ذکر کر رہی تھی لالہ کیدار ناتھ سہگل کے الکشن کا۔ سناتن دھرم ہائی اسکول کے گیٹ کے دونوں طرف بہت بھیڑ تھی۔ ہندو مہا سبھا کے کارکن زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ وہ بلٹر بھی پچار رہے تھے۔ جب انھوں نے بیدی صاحب کو آتے دیکھا تو ایک دم خاموش ہو گئے۔ بیدی صاحب موٹے کھدر کا کرتا پاجامہ پہنے گیٹ پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے للکار کر پنجابی میں کہا کہ دیکھیں تو کون مائی کا لال بلٹر پچار رہا ہے۔ ادھر کانگریسی کارکن اونچی آواز میں نعرے لگا رہے تھے جس میں ہم بچے بھی شامل تھے۔ نعرے تھے "سیاہ پوش جرنیل زندہ باد" "جیل والا یا تیل والا — بھائی جیل والا" "مال تیلیوں کا کھاؤ — ووٹ جیل والے کو پاؤ" یہ نعرہ اس لیے لگ رہا تھا کہ ہندو مہا سبھا کا امیدوار بیلی رام تیل کا مشہور تاجر تھا جس کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہ تھی اور وہ دل کھول کر پیسہ تیل کی طرح بہا رہا تھا، اور دوسری طرف کانگریس کے وہ کارکن تھے جن کے پاس جوش تھا اور وطن پرستی کا جذبہ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کانگریسی ہونے کا مطلب تھا بے غرض قربانی کا راستہ اختیار کرنے والا انسان۔ کانگریس کے ساتھ پیسے کا نام کبھی نہیں جوڑا جاتا تھا، کیونکہ ان دنوں یہ مانا گیا تھا کہ قربانی اور

دولت آپس میں دشمن ہیں۔ جب کیدار ناتھ سہگل — جیل والا ہیرو — تیل کے بڑے تاجر بیلی رام کو بھاری شکست دے رہا تھا تو کسی نے یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب کانگریسی امیدوار تاجر اور صنعت کار ہوں گے اور کانگریس کی الکشن مہم میں لاکھوں کروڑوں کی تھیلیوں کے منہ کھل جایا کریں گے۔

اس وقت تو یہی کہا جاتا تھا کہ کانگریس کا کیا ہے اگر کسی کھمبے پر بھی گاندھی ٹوپی لگا کر اسے الکشن میں کھڑا کر دو تو وہ الکشن جیت جائے گا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر آزادی ملنے کے بعد گاندھی جی کی اس تجویز کو تسلیم کر لیا جاتا کہ اب کانگریس پارٹی نے اپنا مقصد پورا کر لیا اب اسے ختم کر دینا چاہیے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر کانگریسی کھادی پہننا اور گاندھی ٹوپی لگانا بند کر دیتے کیونکہ جو بے عزتی کھادی اور گاندھی ٹوپی کو آج برداشت کرنی پڑ رہی ہے وہ نہ کرنی پڑتی اور مجھ جیسے ڈھیروں لوگوں کو جنھوں نے اپنے بچپن میں کانگریسی، کھادی اور گاندھی ٹوپی کی اتنی عزت دیکھی تھی، شاید یہ ٹھیس نہ برداشت کرنی پڑتی۔

جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے ان دنوں موٹے سے موٹا کھادی پہننا فخر کی بات سمجھی جاتی تھی کیونکہ لوگ کھادی کے کپڑے دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ قربانی کے جذبے کو لے کر پہنا کرتے تھے۔ بیدی صاحب اور فریڈا بیدی موٹے موٹے کھادی کے کپڑے پہن کر نکلتے تو سبھی لوگوں کے لیے وطن پرستی اور سادگی کی مثال ہوتے۔

بیدی صاحب کی ماڈل ٹاؤن کی جھگیوں کا جہاں ان کے ساتھ بریگیڈر بھی رہتے تھے، ایک اپنا ہی سیاسی ماحول تھا۔ وہاں کانگریسی اور کمیونسٹ کارکنوں اور لیڈروں کی بھیڑ جمع رہتی اور ہر وقت سیاسی گفتگو چلتی رہتی۔ کشمیر کی جنگ آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے لیڈر بھی اکثر ان جھگیوں میں جمع ہوتے۔ ان میں شیخ عبداللہ بھی تھے اور غلام محمد صادق بھی۔ نئے کشمیر کی ساری اسکیم ان جھگیوں میں بیٹھ کر تیار کی گئی تھی۔ کشمیر کی آزادی کی مہم میں بابا بیدی اور فریڈا بیدی نے اہم رول ادا کیا ہے۔

مہاشے کشن داس جی ایک ایسی دلچسپ شخصیت تھے جنھوں نے لاجپت رائے بھون میں ہمارے گھر اور ماڈل ٹاؤن میں بیدی صاحب کی جھگیوں میں ایک جیسی جگہ بنا رکھی تھی اور ایک بہت میٹھا اور خوبصورت رشتہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ ہم بچے اکثر ہنس کر کہتے کہ مہاشے جی ہمارے نمائندہ بن کر بیدی صاحب کی جھگیوں میں جاتے ہیں اور لاجپت رائے بھون کا سارا حال وہاں سناتے ہیں۔ بیدی صاحب کی جھگیوں میں ہونے والی ہر بات وہ آکر تفصیل سے ہمیں سناتے تھے۔

مہاشے کشن داس جی ہمارے بابوجی کے بہت پرانے دوست تھے جو کانگڑا میں پالم پور کے پاس مرنڈا گاؤں میں رہتے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر تھے اور لگتا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی پالیسیاں مہاشے جی کی رگوں میں بہہ رہی ہیں کیونکہ وہ ہر بات سیاسی زبان میں کہا کرتے تھے۔ چونکہ ضلع کانگڑا سے ہمارے بابوجی کا گہرا تعلق رہا تھا اور

انھوں نے ایک لمبا عرصہ اسی علاقہ میں سیاسی کام کرنے میں گزارا تھا۔ اسی لیے کانگڑا میں سبھی لوگ انھیں گرو جی کہتے تھے، اور ہم لوگ جب بھی کانگڑا پالم پور اور دھرم شالہ جاتے تو ہمیں وہی عزت ملتی اور ہماری اسی طرح خاطر ہوتی جس طرح کسی گرو کے خاندان کی ہوتی ہے۔ ہم ہر سال گرمیوں میں کانگڑا جاتے تھے۔ کبھی پالم پور رہتے اور کبھی دھرم شالہ جاتے۔ ہمارے بابو جی کے متعلق تو یہ بات مشہور تھی کہ ضلع کانگڑا کے پٹھان کوٹ سے لے کر منالی تک کی سڑک کا ہر پتھر گرو جی کو پہچانتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے بابو جی میلوں میل پیدل چلتے تھے اور کانگڑا کے گاؤں کا دورہ انھوں نے زیادہ تر پیدل چل کر ہی کیا تھا۔

مہاشے بشن داس جی جنھیں ہم سب لوگ مہاشے جی کہہ کر بلاتے، ہم بچوں کو بہت ہی اچھے لگتے اور ہم ہر سال سردیوں میں بے صبری سے مہاشے جی کے آنے کا انتظار کرتے۔ سردیوں کے چار مہینے وہ لاہور ہی میں گزارتے تھے۔ اس وقت لگتا تھا کہ مہاشے جی ہمارے تاؤ جی بھی ہیں، دادا جی بھی اور ایک اچھے دوست بھی۔ کٹر کمیونسٹ مہاشے بشن داس جی گھنٹوں تک روس کے سوشلزم کی باتیں سمجھاتے رہتے اس بات چیت کے دوران وہ بار بار لینن کی تقریروں کی مثال دیتے۔ مہاشے جی راہل سانکرتاین کے بہت دیوانے تھے۔ ان کی ڈھیروں کتابیں مہاشے جی کے مرنڈ اگاؤں کے گھر میں موجود تھیں۔

ہم لوگ کئی بار مرنڈا جاکر مہا شے جی کے گھر رکے تھے۔ مہا شے جی کے بھتیجے جن میں ایک کا نام امریک تھا، مٹی کے تیل کا ڈپو اور دوسری ضروری چیزوں کی دکان چلاتا تھا جس سے اچھی خاصی آمدنی ہوتی تھی۔ امریک اور اس کے بھائی اپنے چچا مہا شے بشن داس جی کی بیحد عزت کرتے تھے اور ان سے پیار بھی کرتے تھے۔

مہا شے جی نے مرنڈا گاؤں میں کمیونسٹ پارٹی کے اخباروں اور دوسرے لٹریچر کی ایجنسی لے رکھی تھی۔ امریک کی دکان کے پچھواڑے میں ایک کمرے میں سارا کمیونسٹ لٹریچر قرینے سے رکھا ہوا تھا۔ مہا شے جی بہت شوق سے اس کی ہر روز جھاڑ پونچھ کرتے۔ ظاہر ہے کہ ضلع کانگڑا کے مرنڈا گاؤں میں جہاں ان دنوں پڑھے لکھوں کی گنتی کم ہوگی، بھلا کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر کون خرید کر پڑھتا؟ لیکن مہا شے جی کی یہی ضد ہوتی کہ میں اپنی روزی خود کماؤں گا، میں اپنے بھتیجوں کے پیسوں پر نہیں پلنا چاہتا۔ اسی لیے مہا شے جی کا بھتیجا امریک اپنے ہی لوگوں کو بھیج کر یہ سارا کمیونسٹ لٹریچر خرید والیتا تاکہ ان کے چچا مہا شے بشن داس جی کو اس بات کی تسکین ہو کہ وہ باقاعدہ روزی کما رہے ہیں۔ اس طرح مہا شے جی وہ پیسے امریک کو دیتے اور کہتے کہ اپنی دکان میں میرا حصہ بھی ڈال لو۔

کتنا پیارا رشتہ تھا مہا شے بشن داس کا اپنے بھتیجے امریک سے جسے وہ اپنے بیٹے سے بھی زیادہ پیار کرتے تھے۔ ادھر امریک ہم لوگوں

سے کہا تھا کہ چاچا جی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ میں۔۔ اپنے ہی لوگوں کو بھیج کر ان کی دکان سے کمیونسٹ لٹریچر خریدواتا ہوں اور پھر مہاشے جی بہت فخر سے ہمارے بابوجی کو یہ کہتے " پرنسپل صاحب میں اپنی کمائی خود کر رہا ہوں اور کون کہتا ہے کہ کانگڑا کے عام لوگوں میں سیاسی بیداری نہیں ہے۔ مرنڈا میں لوگوں کو سوویت روس کے لٹریچر میں اتنی دلچسپی ہے کہ میری کافی کتابیں اور میگزینیں بک جاتی ہیں " ہمارے بابوجی یہ سن کر ہنس دیتے۔ لیکن مہاشے جی کو مرتے دم تک پتہ نہیں چلا کہ ان کی دکان کا کمیونسٹ لٹریچر کون خریدتا تھا۔

مہاشے جی کو اپنی کتابوں اور میگزینوں سے اتنا گہرا لگاؤ تھا کہ ایک بار ۱۹۵۱ء میں اپنے بابوجی کے ساتھ ضلع کانگڑا کا دورہ کرتے ہوئے مرنڈا گئی تو میں نے مہاشے جی سے ایک کتاب پڑھنے کے لیے ادھار مانگی۔ وہ کتاب تھی " والگا سے گنگا تک " جس کے مصنف راہل سانکرتاین تھے۔ مہاشے جی نے مجھ سے یہ وعدہ لیا تھا کہ میں بہت جلد یہ کتاب واپس بھیج دوں گی، لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ یہ کتاب مہاشے جی کو واپس نہ کر پائی اور مہاشے جی اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اسی بات کو نہ بھلا پائے کہ میرے پاس ان کی " والگا سے گنگا تک " موجود ہے۔ جب ۱۹۵۴ء میں میری شادی دیوان بریندر ناتھ سے ہوئی اور مہاشے جی نے اس خبر کو اخباروں میں پڑھا تو وہ بیحد خوش ہوئے۔ انھوں

اپنے کچھ دوستوں سے یہ کہا کہ میں نے تو ان دونوں بچوں کو بچپن میں لاہور میں دیکھا ہے۔ وہ بچپن ہی سے بیریندر کی سیاسی سوجھ بوجھ کے قائل تھے۔ مہاشے جی نے ہمیں اپنی دعائیں دیں لیکن ساتھ ہی مجھے یہ پیغام بھی بھیجا کہ ابھی تک راہل سانکرتاین کی کتاب "والگا سے گنگا تک" واپس نہیں آئی۔ مجھے آج تک اس بات کا رنج ہے کریں نے چاہتے ہوئے بھی اپنے پیارے مہاشے جی کی کتاب کیوں نہیں واپس کی۔ "والگا سے گنگا تک" آج بھی ہماری لائبریری میں موجود ہے اور ہر وقت مجھے پیارے مہاشے جی کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

میں لاجپت رائے بھون میں اپنے گھر میں آنے والے بابو جی کے دوستوں میں اگر دھرم ویر کا ذکر اپنی اس کتاب میں نہ کروں تو وہ شاید نامکمل رہے گی۔ دھرم ویر جی لاہور میں مشہور فلمی رسالہ "چترا" نکالتے تھے۔ ان کا ہمارے خاندان سے بہت پیار تھا ہم نے انہیں ہمیشہ اپنے ہی خاندان کا حصہ مانا تھا۔ دھرم ویر جی جنہیں ہم چچا کہتے تھے ہمارے ہر سُکھ دُکھ میں شامل ہوتے اور آج تک ان کا وہی پیار ہمارے بابو جی اور ہم لوگوں کے لیے بنا ہوا ہے۔

لالہ جگت نارائن جی کے خاندان کے ساتھ بھی ہمارے والدین کی بہت اچھی دوستی تھی۔ مرحوم لالہ جی اور ان کی اہلیہ شریمتی شانتی دیوی اکثر لاجپت رائے بھون میں آیا کرتے تھے۔ شانتی چچی جی نے

ہمیں ہمیشہ اپنے بچوں جیسا پیار دیا۔ اس وقت تو لالہ جی کے دونوں بیٹے مرحوم رمیش چندر اور وجے کمار دونوں بہت چھوٹے تھے لیکن لالہ جی کے خاندان کے سبھی لوگ جس میں ان کے دونوں بیٹے اور بیٹیاں بھی شامل تھے کھادی کے کپڑے پہنتے تھے۔ جالندھر آکر بھی شانتی بہن جی چرخہ کاتتی رہیں۔ جب میں نے ایک مرتبہ ہنستے ہوئے کہا کہ اب اس چرخے کے سوت کی کیا ضرورت ہے تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ جس چرخے نے برسوں ساتھ دیا اس سے ایک ایسا رشتہ پیدا ہو گیا ہے کہ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ جب تک رہیں، ہر روز چرخہ ضرور کاتتی رہیں۔

لالہ جگت نارائن جی کے خاندان سے جو رشتہ لاہور میں شروع ہوا تھا وہ ابھی تک چل رہا ہے، حالانکہ خود لالہ جی کا بھی اور ان کے بڑے بیٹے رمیش چندر کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان دونوں باپ بیٹوں کو پنجاب میں پھیلی فرقہ وارانہ نفرت کا شکار ہونا پڑا ان دونوں ہی کو قتل کیا گیا جو ہمیشہ پنجاب کی تاریخ پر ایک کالا دھبہ رہے گا۔

مرحوم لالہ جگت نارائن جی کے خاندان کے ساتھ ہمارے خاندان کا رشتہ اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ انسانی رشتے سیاست کی دیواروں کو نہیں مانتے۔ ایک دور ایسا آیا جب ہماری بی بی جی اور لالہ جگت نارائن سیاسی طور پر دو الگ کیمپوں میں کھڑے تھے۔ جالندھر شہر کی اسمبلی سیٹ کے الکشن میں ہماری بی بی اور لالہ جی کے درمیان مقابلہ ہوا۔

بی بی جی کانگریس کی امیدوار تھیں اور لالہ جی آزاد امیدوار تھے اور انھیں کانگریس مخالف پارٹیوں کا تعاون مل رہا تھا ڈٹ کر مقابلہ ہوا۔ لالہ جی جیت گئے، لیکن الیکشن کی اس گرمی نے ہم دونوں خاندانوں کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔ لالہ جی کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے مرحوم رمیش چندر اور ان کے چھوٹے بھائی وجے کمار نے بھی ہم لوگوں کے ساتھ اسی طرح رشتہ بنائے رکھا۔ بعض مسائل پر ہم متفق نہ ہوئے لیکن انسانی رشتوں میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو رمیش چندر جی کا قتل کیا گیا ان کے نوجوان بیٹے اشونی نے جس طرح اپنے مرحوم والد اور دادا کا قلم اٹھا کر بے باکی سے لکھنا شروع کیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بے باکی اور لکھنے کی صلاحیت انھیں ورثہ میں ملی ہے۔

لاہور ہی سے لالہ خوشحال چند جی "ملاپ" اخبار نکالتے تھے۔ ان کے ساتھ بھی ہمارے خاندان کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ان کا بیٹا یش اس وقت کانگریس کے نوجوان لیڈروں میں سے ایک تھے۔ وہ جب لیکچر دیتے تو حاضرین خود بخود ان کی طرف کھنچے چلے جاتے۔ یش جی کی گنتی کانگریس کے بہترین تقریر کرنے والوں میں کی جا سکتی تھی۔

ان کے بڑے بھائی رنبیر سنگھ کے قلم میں جادو تھا۔ وہ اپنے

اداریے بہت محنت سے لکھا کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد بھی "ملاپ" کے پڑھنے والے ابھی تک رنبیر جی کے قلم کو یاد کرتے ہیں۔ رنبیر جی ایک اچھے صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ نیک اور رحمدل انسان بھی تھے۔ اسی خاندان کے ایک اور بیٹے یدھ ویر نے بھی اردو اور ہندی کی صحافت میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ وہ حیدر آباد سے اردو اور ہندی میں ملاپ اور روز نامہ ملاپ نکالتے ہیں۔ ان کی اہلیہ سیتا بھی ایک سلجھے ہوئے ذہن کی مالک ہیں۔

یہ ناممکن سی بات ہوگی کہ لاہور سے نکلنے والے روزنامہ "ملاپ" کا ذکر کروں اور "پرتاپ" کی بات نہ آئے۔ روزنامہ پرتاپ کے مالک اور ایڈیٹر مہاشے کرشن اور ان کے بڑے بیٹے ویریندر کے ساتھ ہمارے خاندان کے تعلقات بہت دوستانہ تھے۔ ہماری بی بی جی مہاشے کرشن کو چچا کہتی تھیں، کیونکہ مہاشے جی ہمارے نانا اچاریہ رام دیو کے بہت اچھے دوستوں میں سے تھے یا یوں کہیے کہ بھائیوں کی طرح تھے۔ ہماری بی بی جی اور ویریندر میں بھی بھائی بہن جیسا پیار تھا۔

تقسیم کے بعد ویریندر جی جالندھر سے روزنامہ پرتاپ اردو میں اور ہندی میں ویر پرتاپ نکالنے لگے۔ مہاشے کرشن دلی میں رہتے تھے۔ ان کا قلم بھی بہت طاقتور تھا۔ اُن کا لکھنے کا اپنا انداز

تھا۔ اردو صحافت میں مرحوم مہاشے کرشن کے لکھے اداریوں کا ہمیشہ ایک مقام رہے گا۔

ایک اور شخصیت جس کا ذکر لاہور کی باتیں لکھتے ہوئے نہ کرنا گستاخی ہوگی، وہ تھے مرحوم سادھو سنگھ ہمدرد۔ ہمدرد جی نے صحافت کے ذریعے پنجاب کی سیاست میں اہم رول ادا کیا تھا۔ جب ہم چھوٹے بچے تھے تو لاہور میں ہمدرد جی کے قلم کے متعلق بہت کچھ سنا کرتے تھے لوگوں کا کہنا تھا کہ سادھو سنگھ ہمدرد جیسے صحافیوں کی تحریریں ہی لیڈروں کو بناتی اور گراتی ہیں۔ لاہور میں ہمدرد جی سے ایک دو بار ملنے کا موقع ملا۔ ان کی بات چیت کا انداز نرالا تھا۔ لگتا تھا انھیں ڈھیروں سیاسی لطیفے یاد ہیں۔

جب جالندھر میں سادھو سنگھ ہمدرد سے ملاقات ہوئی، تب وہ پنجابی میں روزنامہ اجیت کے ساتھ دو ماہنامے بھی نکال رہے تھے۔ بطور صحافی کے ان سے بات چیت کرنا کافی مشکل کام تھا کیونکہ کسی بھی دلیل میں ان سے جیتا نہیں جا سکتا تھا۔ ہمدرد جی کا انتقال ہندوستان کے صحافیوں کے لیے ایک بہت بھاری نقصان ہے ان کی اہلیہ پرکاش کور ہمدرد ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ انھوں نے بھی روزنامہ اجیت کو اچھے ڈھنگ سے چلانے میں ہمدرد جی کا پورا ساتھ دیا۔

لاجپت رائے بھون کا خاندان

جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ لاجپت رائے بھون میں رہنے والے سبھی کانگریسی خاندان ایک بڑے خاندان کا حصہ دکھائی دیتے تھے۔ لوگوں میں اپنا پن تھا۔ وہ ایک دوسرے کے سکھ دکھ میں شریک ہوتے تھے۔ لاجپت رائے بھون ہی میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو رہتے تھے جن کا پنجاب کی سیاست میں بہت اہم مقام رہا ہے اور جو برسوں تک ملک کی تقسیم کے بعد بھی پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ایک بڑی سی ڈھائی منزلہ عمارت میں رہتے تھے جو لال اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس کا نام ہی "ڈاکٹر گوپی چند والا حصہ" پڑ گیا تھا۔

ہم میں سے اگر کسی بچے کو ننانوے ۹۹ ڈگری بخار بھی ہو جاتا یا معمولی سا پیٹ درد ہوتا یا سر دکھنے لگتا تو فوراً ہمیں ڈاکٹر گوپی چند کے پاس لے جایا جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کے آس پاس ہمیشہ سیاسی کارکنوں کا

مجمع لگا ہوتا۔ ہم اپنی بی بی جی کے ساتھ وہاں پہنچتے تو پہلے آدھ پون گھنٹہ سیاست پر گفتگو ہوتی، پھر کہیں ڈاکٹر گوپی چند ہماری نبض دیکھتے۔ ہم بچوں کو بھی یہ سیاسی گفتگو بہت اچھی لگتی۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر میں جو کانگریسی کارکن موجود ہوتے، ہم انھیں بھی اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔

ڈاکٹر گوپی چند ہم بچوں کو ڈاکٹر دکھائی دیتے ہی نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم انھیں ہر وقت سیاسی باتیں کرتے دیکھتے تھے۔ جب وہ ہمارا معائنہ کرتے تو ہم بچے اکثر اپنی ماں سے یہی سوال کرتے، کیا گوپی چند بھارگو نے سچ مچ ڈاکٹری پڑھی بھی ہے؟ ہمیں ہر وقت اپنی ماں سے ڈانٹ سننی پڑتی کہ ہم لوگوں کا دماغ خراب ہے کیونکہ مفت میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جیسا نامی ڈاکٹر ہمارا معائنہ کرتا ہے اور علاج کرتا ہے، اس لیے ہم ان کی قدر ہی نہیں کر رہے۔

اس زمانے میں ہم بچوں کی تھوڑی سی بھی طبیعت خراب ہوتی تو ہمارا معائنہ لاہور کے بڑے بڑے نامی ڈاکٹر کرتے۔ یہ ڈاکٹر اس وقت کے کانگریسی کارکنوں کی اتنی عزت کرتے تھے کہ ہم لوگوں کے معائنے اور علاج کے لیے کسی بھی ڈاکٹر نے کوئی پیسہ نہیں لیا۔ ان تمام ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ جنگ آزادی میں کانگریسی اور ان کے بچوں کی خدمت کر کے وہ اپنا حصہ بٹا رہے ہیں۔ سنہ ۴۳-۱۹۴۲ء میں جب ہماری بی بی جی اور بابو جی دونوں جیل میں تھے تو میری بہن سنتوش اور مجھے، دونوں کو خسرہ ہو گیا تھا اور خسرہ

کے بعد بیمار رہنے لگا تھا تو اس وقت ہمارا علاج لاہور کے بہت مشہور ڈاکٹر بھگت رام نے کیا تھا۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ ہماری نانی جی یا ہماری بی بی جی ہمیں لے کر ڈاکٹر بھگت رام کے پاس جائیں اور وہ ہمیں بہت دیر تک انتظار کروائیں۔ ڈاکٹر بھگت رام کی سفارش پر ہی پنجاب کے گورنر نے ہماری بی بی جی اور بابو جی کو جیل سے پیرول پر چھوڑا تھا۔

ڈاکٹروں کا ذکر کرتے ہوئے اگر میں ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کا ذکر نہ کروں تو یہ یقیناً ایک بہت بڑی حماقت ہوگی۔ ڈاکٹر روشن لال کھیڑا جو پنجاب کے مشہور سرجن تھے اور جن کا لاہور نسبت روڈ پر اپنا بہت بڑا اسپتال تھا، ہمارے بابو جی اور ان جیسے بہت سے سیاسی کارکنوں کے لیے ایک اچھے دوست کی شکل میں آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کھیڑا نے اسپتال کے کچھ کمرے سیاسی کارکنوں کے لیے الگ رکھ چھوڑے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جہاں ان کارکنوں کا آپریشن وغیرہ مفت کرتے وہاں قیمتی دوائیں بھی اسپتال کی طرف سے دیتے اور ان مریضوں کے لیے کھانا تک ڈاکٹر صاحب کے گھر سے آتا۔ ہمارے بابو جی بتاتے تھے کہ ۱۹۳۵ء میں جب دہرادون میں ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی تھیں تو وہ پورے تین سال تک ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کے اسپتال میں رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا اچھی طرح سے علاج کیا اور کبھی انھیں مایوس نہیں ہونے دیا۔ وہ انھیں ہر وقت ہنساتے رہتے اور جتنی جلد ممکن ہو سکتا تھا، انھیں اس لائق بنا دیا کہ وہ پھر سے اپنی دونوں ٹانگوں پر

کھڑے ہو سکیں، اور سیاسی کام کر سکیں۔ ہم لوگ ڈاکٹر روشن لال کھیڑا
کے اس قرض سے کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتے۔

تقسیم کے بعد ڈاکٹر روشن لال کھیڑا نے جالندھر میں اپنا اسپتال
کھولا اور پھر وہ دلی آ گئے۔ پٹیل نگر میں ان کا اسپتال چلتا رہا۔ آج بھی
نارائنا روڈ پر کھیڑا اسپتال موجود ہے۔ ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کا انتقال
۲ر فروری ۱۹۷۳ء کو ہوا۔ جب تک ڈاکٹر صاحب خود آپریشن کر سکتے
تھے، وہ اپنے اسپتال میں غریب لوگوں کا مفت آپریشن کرتے رہے۔
ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ اگر کوئی انسان مجھ سے آ کر کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب
میں غریب ہوں، میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں تو میں اس کا آپریشن
مفت کر دیتا ہوں، چاہے وہ انسان لکھ پتی ہی کیوں نہ ہوں، جو انسان خود
کو غریب کہتا ہے، وہ سچ مچ غریب ہے۔

ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر کرشن کھیڑا جو آج کل
کھیڑا اسپتال اور نرسنگ ہوم چلا رہے ہیں، اپنے والد کی طرح بہت
لائق اور فراخ دل انسان ہیں ان کی گنتی دلی کے بہترین نوجوان سرجنوں میں
ہوتی ہے۔ پلاسٹک سرجری میں ڈاکٹر کرشن کھیڑا نے خاص طور سے
مہارت حاصل کی ہے۔ ڈاکٹر کرشن کھیڑا بھی اپنے مرحوم والد کی طرح غریب
لوگوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کو پنجاب کے
سارے کانگریسیوں کے نام زبانی یاد تھے۔ ہماری جنگِ آزادی کی
تاریخ لکھتے وقت ڈاکٹر روشن لال کھیڑا کا نام کانگریسی کارکنوں کے

دکھ درد کو دور کرنے والے سب سے بڑے محسن اور ہمدرد کی شکل میں آئے گا۔

لاجپت رائے بھون میں لالہ موہن لال جی، لالہ اچنت رام جی اور لالہ جگت ناتھ جی کے خاندان ایسے تھے کہ جن کے متعلق میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ہم سے الگ ہیں۔ جہاں ہمارے والدین کی ان کے ساتھ گہری دوستی تھی، وہاں ان کے بچوں کو بھی ہم اپنا سگا بھائی بہن سمجھتے تھے۔ لالہ اچنت رام جی کو ہم چچا کہتے اور ان کی اہلیہ ستیہ وتی، جنھیں ہم چچی کہتے تھے، آج بھی وہ ہم سے اسی طرح پیار کرتی ہیں جس طرح لاجپت رائے بھون میں کیا کرتی تھیں۔ میں بھاپا کرشن کانت کا ذکر تو پہلے بھی کر چکی ہوں۔ انھیں کی بہن سبھدرا سے وپتے بیبا جی کی گہری دوستی تھی۔ ہماری بہن جب کبھی ہمیں مارتیں یا ڈانٹتیں تو ہم اس کی شکایت سبھدرا بہن جی سے ہی کرتے تھے۔ نرمل جنھیں ہم پیار سے ممی کہتے تھے، ہماری جیل کی ساتھی تھی۔ اکثر ممی سے جھگڑا ہو کر کٹی ہو جاتی تھی، لیکن اگلے دن پھر صلح۔ ستیہ وتی چچی کہا کرتی تھیں کہ آپس میں کُٹی کرتے رہو لیکن اگر تمھاری ماں گھر میں نہ ہو تو کھانا یہیں آکر ہی کھاؤ۔ اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ ستیہ وتی چچی گھر میں نہ بھی ہوتیں تو ہم باورچی خانے میں رکھے کھانے کو خود ہی اٹھا کر کھا لیتے۔ ہمیں کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ ان کا گھر ہمارا گھر نہیں ہے۔

اسی طرح کے تعلقات لالہ موہن لال جی کے خاندان کے ساتھ تھے۔ شکنتلا چچی ہمیں بہت پیار کرتیں۔ یہاں تک ان کے سارے رشتہ دار

ہمیں اپنا سمجھتے تھے۔ موہن لال چچا کا تو انتقال ہو گیا۔ آج بھی شکنتلا چچی جالندھر میں رہتی ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے رمیش، اس سے چھوٹے کرشن اور سب سے چھوٹے بیٹے مرحوم اندر کو ہم اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ ان کی بیٹیوں سدرشن اور راج کو ہم نے ہمیشہ اپنی بہن سمجھا۔ برسوں کے بعد آج بھی جب ہم شکنتلا چچی سے ملتے ہیں تو وہ ہمیں اتنا ہی پیار کرتی ہیں۔ مرحوم موہن لال جی کے پتا جی اور ماتا جی جنہیں سب 'بے بے جی' کہتے تھے ہم سے وہ اپنے پوتے پوتیوں کی طرح پیار بھی کرتے تھے اور ناراض ہو کر جھڑکیاں بھی دیتے تھے۔

لالہ جگت ناتھ جی کا خاندان بھی لاجپت رائے بھون ہی میں رہا کرتا تھا لیکن بعد میں جگن ناتھ چچا لاہور سے چلے گئے تھے۔ وہ بھی ہمارے بابو جی کی طرح "سرونٹ آف پیوپل سوسائٹی" کے ممبر تھے۔ ان کی اہلیہ بسنتی دیوی کو بھی ہم اپنی چچی سمجھتے۔ ان کے بچے تھے سریندر، دیجے، ساوتری اور کنتی۔ اس خاندان کے ساتھ بھی ہمارا اتنا اپنا پن تھا کہ کبھی یقین ہی نہیں ہوا کہ وہ ہمارے اپنے رشتہ دار نہیں ہیں۔ ساوتری بہن جی کی شادی مدن گوپال جی سے ہوئی تھی وہ بھی کانگریسی تھے۔ ساوتری بہن جی نے اپنی شادی کے موقع پر گلابی کھادی کا جوڑا پہنا تھا، ان کا قد چھوٹا تھا جس سے وہ بہت ہی خوبصورت گڑیا سی دکھائی دیتی تھیں۔ ساوتری بہن جی کا پیار آج بھی ہمارے ساتھ ویسے ہی ہے جیسے لاہور میں ہوا کرتا تھا۔ مدن گوپال جیجا بھی ہم سے بہت پیار کرتے ہیں۔

جگت ناتھ چچا کا تو انتقال ہو گیا لیکن ان کا اور بسنتی چچی کا ہنستا ہوا چہرہ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔ بسنتی چچی ہنستی تھیں تو بہت خوبصورت دکھائی دیتی تھیں۔ ان کا چہرہ ہمیشہ پھول کی طرح کھلا رہتا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی جب کبھی بسنتی چچی سے ملاقات ہوئی ہے، میں نے انہیں ہنستا ہوا ہی دیکھا ہے۔

لاجپت رائے بھون میں لالہ اوتار نارائن گجرال اور ان کی اہلیہ پشپاوتی گجرال کا آنا بھی اکثر رہتا۔ یہ لوگ جہلم میں رہتے تھے لیکن اکثر لاہور آتے تھے۔ ہم پشپاوتی گجرال کو پھوپھی کہتے تھے اور گجرال صاحب کو پھوپھا جی۔ ان کے بڑے بیٹے اندر کمار گجرال جن کا ہندوستانی سیاست میں اہم مقام رہا ہے اور جو برسوں تک مرکزی کابینہ میں وزیر بھی رہے ہیں اور بعد میں روس میں ہندوستان کے سفیر بھی، بچپن سے ہی وہ ہمارے اندر بھائی صاحب ہی تھے اور ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی ستیش گجرال کا نام ہندوستان کے بڑے مصوروں میں لیا جاتا ہے۔ ستیش گجرال نے چھوٹی سی عمر میں تصویریں بنانی شروع کی تھیں۔ پشپاوتی پھوپھی کی دونوں بیٹیاں اوما اور سنیتی بھی جہلم سے لاہور آتی رہتی تھیں۔ سنیتی کو سب نیتی کہتے تھے۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب ہم لوگ لاہور سے جالندھر آئے تو ہمارے پاس رہنے کے لیے کوئی گھر نہ تھا۔ گجرال صاحب ان دنوں جالندھر میں تھے۔ انھوں نے اپنے گھر کا ایک حصہ ہمیں دے دیا۔ ہم

پورے ایک سال تک ان کے گھر میں رہے۔ پھوپھا جی اوتار نارائن گجرال کا تو انتقال ہو گیا، لیکن پشپا وتی گجرال آج بھی جالندھر میں رہتی ہیں۔ انھوں نے تقسیم کے دوران مہاجر ہوئی عورتوں کو پھر سے بسانے کے لیے قابل تعریف کام کیا ہے۔ انھوں نے بیوہ اور بے سہارا عورتوں کو ٹریننگ دینے کے لیے ایک کیمپ بھی چلایا۔ اس کیمپ میں ہزاروں عورتوں نے ٹریننگ لی اور آج اپنے پیروں پر کھڑی عزت سے روزی کما رہی ہیں۔

لاہور کی سیاسی کارروائیوں اور خاص طور سے لاجپت رائے بھون کا ذکر کرتے ہوئے میری آنکھوں کے سامنے بہت سے چہرے آجاتے ہیں۔ بہت سے لوگ تو ایسے تھے جو لاجپت رائے بھون ہی میں رہا کرتے تھے اور دوسرے ایسے تھے جن کا وہاں آنا جانا رہتا تھا۔

مرحوم دیو راج سیٹھی جنھیں ہم ماموں کہتے تھے، لاجپت رائے بھون کے ایک کمرے میں رہا کرتے تھے، جسے ہم سیٹھی جی والا کمرہ کہتے تھے۔ سیٹھی جی جو بعد میں پنجاب ودھان سبھا / ودھان پریشد کے ممبر بھی بنے، سیاست میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ جب وہ ہنستے تھے تو سارا ماحول قہقہوں سے گونج اٹھتا تھا۔ وہ ہم سے ہمیشہ یہی پوچھتے کہ ہم لوگوں نے کس طرح سے بٹوارہ کیا ہے۔ کسی کو چچا کہتے ہیں اور کسی کو ماموں۔ پھر وہ خود ہی اس نتیجہ پر پہنچتے کہ شاید جو لوگ غیر شادی شدہ ہیں، انھیں ہم لوگ ماما جی کہتے ہیں۔ دیو راج سیٹھی خود غیر

شادی شدہ تھے لیکن لاجپت رائے بھون کے ہم بچوں نے ماموں اور چچا کا بٹوارہ شاید بے سوچے سمجھے ہی کر رکھا تھا۔

شری پرتھوی سنگھ آزاد بھی لالہ لاجپت رائے کی بنائی گئی سرونٹ آف پیوپل سوسائٹی میں ہی کام کرتے تھے۔ آزاد صاحب کا تو ہمارے گھر میں ہر وقت کا آنا جانا تھا۔ ہم بچے اکثر مچل کر انھیں پکڑ کر بیٹھ جاتے کہ وہ ہم سے باتیں کریں لیکن وہ ہمیں ڈانٹ کر بھگتے کہ ہم لوگ ان کے دفتر کے باہر بہت شور کرتے ہیں۔ ان کے دفتر کی ایک کھڑکی ہمارے گھر کے صحن میں کھلتی تھی۔ لاجپت رائے بھون میں ایک بڑا حصہ سرونٹ آف پیپل سوسائٹی کے دفتر، دوارکا داس لائبریری اور لاجپت رائے بھون کا ہال تھا۔ دوسرے بڑے حصے میں سوسائٹی کے حیاتی ممبر رہتے تھے۔ انھیں کے ساتھ کچھ گھر ایسے بنائے گئے تھے جہاں سوسائٹی کے ممبر آکر ٹھہرتے تھے لمبے برآمدے تھے اور چاروں طرف باغیچے تھے جہاں آم اور جامن کے بہت سے درخت بھی تھے۔

لاجپت رائے بھون کے ایک دوسرے الگ سے بنے حصے میں شری گردھاری لال پوری کا خاندان رہتا تھا۔ اسی حصے کے سب سے اوپر کی منزل میں اوم پرکاش ترکھا اپنی بیوی دیہ لکشمی کے ساتھ رہتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے خاندان بھی لاجپت رائے بھون کے احاطے میں رہتے تھے جن کا سیاست کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ انھیں میں تھا ہماری سہیلی راج اور اس کا بھائی نند بھی تھے یہ لوگ کھادی نہیں پہنتے

تھے اور ہم بچے ان کے ولایتی کپڑوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ہماری یہی کوشش ہوتی کہ ان کی ذہنیت کو بدلیں اور انھیں جنگِ آزادی کا حامی بنائیں۔

ایک لحاظ سے تو یہ لوگ جنگ آزادی کے حمایتی تھے۔ جب ہمارے ماں باپ جیل چلے جاتے تو راج اور اس کا بھائی نند ہم سے کہتے کہ ہم ان کے گھر کھانا کھالیں۔ ان دنوں وہ ہم سے جھگڑا بھی نہیں کرتے تھے۔ ہمیں ان کی یہ ہمدردی بہت ہی ناگوار لگتی۔ ہم بچے یہ سمجھتے تھے کہ یہ ہمدردی خیرات کی طرح ہے جسے ہم قبول نہیں کر سکتے۔

لاجپت رائے بھون کا ذکر کرتے ہی میری آنکھوں کے سامنے گردھاری لال جھنٹو کا چہرہ آجاتا ہے۔ کھلی سفید داڑھی، لمبے بکھرے بال اور تہمند یا دھوتی کے اوپر لمبا سا کرتا اور پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں پہنے وہ اکثر ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہوسٹل اور لاجپت رائے بھون کے درمیان بنی سڑک پر گھومتے نظر آتے تھے۔ بات بات پر وہ ہم بچوں کو ڈانٹتے تھے اور ہم بھی ہمیشہ اسی تاک میں رہتے کہ انہیں پریشان کریں۔ گردھاری لال جھنٹو جنہیں کالج کے لڑکے جھنٹو جھب کہہ کر چھیڑتے تھے، اپنے ہاتھ میں ایک بڑا سا موٹا ڈنڈا اٹھائے رہتے۔ جب بھی وہ کسی نوجوان لڑکی کو دوپٹہ گلے میں ڈالے گھومتے دیکھتے تو اپنے ڈنڈے سے اس کا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیتے۔

چونکہ گردھاری لال جھنٹو ہم بچوں کو ہمیشہ دھمکاتے اور ڈانٹتے تھے

اس لیے ہم بھی ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے کہ انھیں پریشان کریں. جھنوجی ہر روز اپنا لوٹا اٹھا کر لاجپت رائے بھون کے باغیچے کے پاس بنے پاخانے میں آتے۔ ایک دن شام کو جب ہم نے سڑک سے ہی گردھاری لال جھنو کی کھڑاؤں کی آواز سنی تو ہم نے باتھ روم میں لگا بجلی کا بلب اتار لیا اور کاغذ کا بنا کالا سانپ وہاں لگا دیا۔ اس دن ہم نے گردھاری لال جھنو کو پریشان نہیں کیا بلکہ بہت تمیز سے نمستے کیا۔ جونہی وہ دروازے کے اندر گئے تو ان کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں وہ خوف زدہ ہو کر کانپ رہے تھے، لوٹا گر چکا تھا۔ لاجپت رائے بھون میں رہنے والے بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے وہاں آئے اور ٹارچ کی روشنی میں انھوں نے کاغذ کے اس سانپ کو اٹھا لیا۔ گردھاری لال جھنو اپنا ڈنڈا لے کر ہم بچوں کے پیچھے بھاگے۔ ہم گھر کے اندر بڑے پلنگوں کے نیچے چھپ گئے، لیکن وہ گالیاں بکتے ہوئے اپنا ڈنڈا ان پلنگوں کے نیچے چلاتے رہے۔ اس دن کے بعد گردھاری لال جھنو پھر کبھی اپنا لوٹا اٹھا کر لاجپت رائے بھون میں نہیں آئے۔ ہم بچوں کو برا بھی لگا کیونکہ جھنوجی ہماری زندگی کا ایک حصہ بن چکے تھے

لاجپت رائے بھون میں ہمارے بابوجی کے پاس ایک آدمی آتا تھا جو سوویت روس اور وہاں کے لیڈروں کا شیدائی تھا۔ ایک دن اس نے اپنے لڑکے کو اسکول میں بھرتی کروانے کے لیے ہمارے بابوجی کی مدد مانگی۔ بابوجی اسے لے کر ڈی۔ اے۔ وی اسکول میں

گئے۔ وہاں جب ہیڈ ماسٹر نے داخلے کا فارم بھرنے کے لیے دیا تو انھوں نے کہا کہ نام کے لیے بنا خانہ بہت چھوٹا ہے۔ جب ہیڈ ماسٹر نے پوچھا کہ آپ کا اور آپ کے بیٹے کا نام کیا ہے؟ تو انھوں نے اپنا نام بتایا کامریڈ ولادی میر ایلیاچ النائو نیکولائی لینن۔ جب ان سے ان کے بیٹے کا نام پوچھا گیا تو انھوں نے اس کا نام روس کے لیڈر اسٹالن کے پورے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑ کر بتایا۔ ظاہر تھا کہ ان ناموں کو لکھنے کے لیے دو خانے نہیں بلکہ آدھا صفحہ چاہیے تھا۔ جب داخلے کے فارم میں بھرنے کے لیے ان کا پتہ پوچھا گیا تو انھوں نے لکھایا ساری دنیا کا باشندہ ساری دنیا میرا گھر۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے ہمارے بابوجی کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا چونکہ وہ بابوجی کا بہت احترام کرتے تھے اس لیے انھوں نے اس شخص کے بیٹے کو داخل کر لیا لیکن یہ کہا کہ داخلے کا فارم میں تو اس کا تین لائنوں میں چلتا ہوا نام بھر لوں گا لیکن کلاس میں اس کا نام محض اسٹالن ہوگا۔ اس بچے کو اس کے تمام ٹیچر اور ساتھی مذاق سے چھیڑا کرتے تھے۔

لاجپت رائے بھون کے ایک طرف سناتن دھرم ہائی اسکول تھا۔ ٹھیک سامنے ڈی۔ اے۔ وی۔ کالج کا ہوسٹل اور دوسری جانب اگروال ہوسٹل۔ اس ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ شادی لال اگروال ہمارے بابوجی کے دوست تھے۔ ان کی بیٹیوں سے بھی ہماری بہت دوستی تھی۔ ان کے گھر ہمارا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آتیں۔ ان کی

امی ہمیں بہت پیار کرتی تھیں۔ ہم جب بھی ان کے گھر جاتے تو وہ ضد کرتیں
کہ ہم وہاں کھانا کھائیں۔ ہمیں ان کے گھر کا کھانا بہت اچھا لگتا تھا۔

جہاں لاجپت رائے بھون میں ہم سیاسی ڈرامے کیا کرتے تھے
وہاں اگروال صاحب کی بیٹیوں کی ضد ہوتی کہ ہم ان کے ساتھ مل کر کرشن
سداما کا ڈرامہ کھیلیں۔ ایک دن مجھے بہت ہی غصہ آیا جب پپّی، جس کا
اصلی نام پشپا تھا، خود تو کرشن بن گئی اور مجھے سداما بنا دیا۔ میں دو دن
تک ضد کرتی رہی کہ میں ہمارا ج کرشن کے غریب برہمن دوست
سداماں کا رول نہیں کروں گی۔ میری بہن سنتوش نے مجھے بہت سمجھایا
کہ سداماں کا رول بہت اہم ہے۔ کیونکہ ہم پپّی اور ان کی بہن سے دوستی
نہیں توڑنا چاہتے تھے اس لیے میں نے پارٹ کرنا مان لیا۔

ایک دن ریہرسل کے دوران جب پپّی نے بہت شیخی سے کہا
کرشن جی کے پہننے کے لیے تو شاندار ساڑی وہ اپنی ماں سے لے
لے گی اور سداماں اور اس کی غریب بیوی کے لیے تو ہمارے پاس
ڈھیروں گندی کھادی کی ساڑیاں اور کرتے ہیں ہی تو اس بات پر
ہماری ان کے ساتھ جم کر لڑائی ہوئی۔ میں اور سنتوش وہاں سے
ناراض ہو کر آ گئے۔ ہم نے پپّی کو خوب کھری کھری سنائیں کہ اس نے کھادی
کی توہین کیوں کی۔ ہم نے غصہ میں یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ ہم ان کی ساری
ولایتی چمچماتی ساڑیوں کو پھاڑ دیں گے۔

پپّی ڈر گئی وہ جانتی تھی کہ ہماری یہ دھمکی جھوٹی نہیں ہے۔ سنتوش اور

میں نے کچھ عرصہ پہلے اپنی خالہ چندر پربھا کی ولایتی ساڑی کا سارا بارڈر کاٹ دیا تھا۔ حالانکہ ہم اپنی ان خالہ سے بہت پیار کرتے تھے، لیکن ہمیں اس بات کا غصہ تھا کہ وہ سرگودھا سے آکر جب ہمارے گھر ٹھہرتی ہیں تو ڈھیروں ولایتی کپڑے خرید کر لاتی ہیں۔ جب ہمارے چھوٹے ماموں ستیہ بھوشن یوگی جو ہندی کے مشہور شاعر تھے اور بعد میں برسوں تک دلّی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں سنسکرت کے شعبے کے ہیڈ رہے، کی شادی ۱۹۴۳ء میں ہوئی تھی اس وقت ہماری بی بی جی اور بابو جی دونوں جیل میں تھے۔ تب بھی ان کی شادی کے لیے بنائی جانے والی ان تمام ساڑیوں کو ہم نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے جو ولایتی تھیں۔ میں اور سنتوش جب کبھی اپنی نانی جی سے ناراض ہوتے تو غصے سے کہتے کہ ہم سارے ولایتی کپڑوں کو جلا دیں گے۔

ہمارے بڑے ماموں پنڈت یشپال جی، گرودت بھون میں رہتے تھے اور آریہ سماج کے نامی لیڈروں میں ان کی گنتی ہوتی تھی۔ وہ خود تو کھادی پہنتے تھے لیکن ہماری مامی جی شنیتی دیوی اور ان کے بچے بھارت بھوشن، ششی کانت، روی کانت اور ششما کھادی کے ساتھ دوسرے کپڑے بھی پہنتے تھے۔ ان کی بیٹی پرتبھا تقسیم وطن کے بعد جالندھر میں پیدا ہوئی تھی۔ ہم لوگ ہر اتوار کو اپنے ماموں کے گھر جاتے تھے۔ ہماری مامی بہت ہی اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ ان کے ہاتھ کی پکی میتھی، آلو گوبھی اور بینگن آلو کا ذائقہ آج تک نہیں بھلا پائے

ہیں۔ ہماری مامی بہت ہی حسین ہیں۔ ماموں کے انتقال کے بعد وہ ہردوار کے قریب رشی کیش میں بنے شودرگ آشرم میں اپنا سارا وقت کتابیں پڑھنے میں گزارتی ہیں۔ ان کے سبھی بچے بہت کامیابی سے اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اپنی ممانی کا کھادی نہ پہننا ہم بچے اس لیے معاف کر دیتے تھے کیونکہ وہ بہت اچھا کھانا بناتی تھیں اور ہمیں بہت پیار بھی کرتی تھیں۔

ہمارے چھوٹے چچا گوپال کرشن گوال منڈی میں ایک اسکول چلاتے تھے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ان کا اسکول لاہور میں اپنی قسم کا واحد اسکول تھا۔ جہاں بچوں کو مار نہیں پڑتی تھی بلکہ انھیں دوست سمجھ کر پڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے چچا انھیں عجائب گھر، چڑیا گھر اور لارنس گارڈن گھمانے لے جاتے اور ان سے بات چیت کرتے کرتے انھیں پڑھاتے بھی جاتے۔ اگر کوئی بچہ ان سے یہ شکایت کرتا کہ کسی ٹیچر نے اسے مارا ہے، تو ٹیچر کی جواب طلبی ہوتی۔ بچوں کی مار پیٹ کرنے والے کئی ٹیچروں کو ہمارے چچا نے نوکری سے الگ کر دیا تھا۔

چچا گوپال کرشن ہر سنیچر کو ہمارے گھر آتے اور ہمیں گھمانے لے جاتے وہ ہم بچوں کو ایک ایک روپیہ دیتے۔ ہمارے جتنے بھی دوست اس وقت وہاں موجود ہوتے، انھیں بھی وہ ایک ایک روپیہ دیتے۔ ہماری دادی اکثر چچا سے کہا کرتیں کہ جب تمہیں دنیا بھر کے بچوں سے اتنا پیار ہے تو اپنا

گھر کیوں نہیں بسا لیتے ؟ چچا ہمیشہ ہنس کر یہی کہتے جب مجھے ڈھیروں بچے ملے ہوئے ہیں تو میں گھرداری کے جھنجھٹ میں کیوں پڑوں ۔ ہمارے چچا ہمیشہ کھادی پہنتے تھے لیکن ہنسی ہنسی میں ہماری ماں سے یہی کہتے رہتے " میں کانگریسی نہیں ہوں ۔ کھادی تو اس لیے پہنتا ہوں کہ یہ ہماری آب و ہوا کے عین مطابق ہے ۔ ہم بچے ہر ہفتے بے صبری سے سنیچر کا انتظار کرتے کیونکہ اسی دن ہمارے پیارے گوپال چچا آیا کرتے تھے ۔

لاہور کی سیاسی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے مرحومہ ماتا رامیشوری نہرو کے متعلق لکھنا بہت ضروری ہے ۔ ایک تو اس لیے کہ ان کے ہمارے خاندان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات تھے ، دوسرے انھوں نے ہمیشہ ہماری بی بی جی کو اپنی چھوٹی بہن کی طرح مانا اور جب ۱۹۴۶ء میں ماتا جی نے پنجاب اسمبلی کی ممبری سے استعفا دیا تو اس سیٹ کے لیے انھوں نے ہماری بی بی جی کا نام ہی تجویز کیا اور بعد میں ہماری بی بی جی پنجاب اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں ۔

ماتا رامیشوری نہرو نے ہریجنوں کے سدھار کے لیے بہت سرگرمی سے کام کیا ۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ جب تک ہندوستان میں ہریجنوں کی حالت نہیں سدھرے گی تب تک ہماری آزادی نامکمل رہے گی ۔ تقسیم کے بعد ماتا جی دلّی کی ہریجن کالونی میں رہنے لگیں ۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک ہم ہریجنوں سے دور رہیں گے ، ہم انھیں اپنا نہیں بنا سکیں گے ۔ ماتا رامیشوری نہرو کا تعلق کشمیر کے

ایک اونچے برہمن خاندان سے تھا - ان کے شوہر، پنڈت جواہر لال نہرو
کے رشتے کے بھائی تھے - ماتاجی کے بیٹے شری بی - کے نہرو آسام
اور جموں کشمیر کے گورنر بھی رہ چکے ہیں - ان کی سیاسی سمجھ بوجھ
اپنے والدین کی طرح ہے - ماتاجی کے بھائی دیوان آنند کمار کا نام پنجاب
کی اہم شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا -

لاہور میں ماتاجی کے گھر ہمارا اکثر جانا ہوتا اور وہیں میں نے
پہلی بار مہاتما گاندھی کو دیکھا تھا - مہاتما گاندھی جب بھی لاہور آتے
وہ ماتاجی کے پاس ٹھہرتے - جس دن پہلی بار میں نے اپنے ہوش
میں مہاتما گاندھی کو دیکھا تو پورے ایک گھنٹے تک ان کے چہرے کو
دیکھتی رہی شاید میں کروڑوں ہندوستانیوں کی طرح یہی سوچتی تھی
کہ یہ دُبلا پتلا سا انسان برٹش سامراج سے کس طرح ٹکر لے گا -
گاندھی جی کے مسکرانے اور ہنسنے کا انداز اتنا پیارا تھا کہ وہ فوراً
غیر کو بھی اپنا بنا لیتے - جب میری بہن سنتوش اور میں گاندھی جی سے
ملنے گئی تو انھوں نے ہمیں پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا ہمارا نام پوچھا
اور ہنس کر کہنے لگے کہ کیا تمہیں آزادی کا کوئی گانا آتا ہے؟ سنتوش اور
میں دونوں شرما رہے تھے - ہم نے محض اپنا سر ہلا کر ہامی بھری - گاندھی جی
کے ساتھ گفتگو کرنے کی ہمیں ہمت نہ ہوئی -

جب پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آتے تو وہ پنجاب کے
مشہور کانگریسی لیڈر میاں افتخارالدین کے گھر ٹھہرتے - یہ گھر

لاہور شہر سے کافی دور کینال روڈ پر بنا تھا۔ میاں افتخار الدین ہمارے بابوجی کے دوست تھے۔ میاں والی جیل میں بابوجی اور میاں صاحب کافی عرصے ایک ساتھ نظر بند رہے تھے۔ بابوجی ہمیں بتاتے کہ جیل میں میاں افتخار الدین کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جسے بابوجی بہت شوق سے پڑھتے اور میاں صاحب کے گراموفون پر ریکارڈ سنتے۔ میاں افتخار الدین، بیدی صاحب اور فریڈا بیدی کے بھی بہت قریبی دوست تھے۔ ۱۹۵۷ء میں جب میں اپنے شوہر کے ساتھ پہلے مغربی ایشیائی دورے کے دوران لاہور گئی تو وہاں میاں افتخار الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ تب بھی اسی طرح ہنستے تھے جس طرح میں نے انھیں اپنے بچپن میں لاہور میں ہنستے ہوئے دیکھا تھا۔

ہمارے بابوجی ہمیشہ خان عبدالغفار خان، جنھیں احتراماً بادشاہ خاں کہتے تھے اور جنھیں سرحدی گاندھی بھی کہا جاتا تھا، کا ذکر اکثر پیار سے کیا کرتے تھے۔ بابوجی بتاتے تھے کہ کس طرح جب میں بہت چھوٹی تھی تو بی بی جی اور بابوجی کے ساتھ پشاور گئی تھی۔ وہاں ہم بادشاہ خاں سے بھی ملنے گئے تھے تو انھوں نے بہت پیار سے اپنی گود میں بٹھایا تھا۔ مجھے تو محض اتنا یاد ہے کہ ان کے گھر کے باہر باغ میں ایک جھولا تھا۔ میں اس جھولے پر بیٹھی تھی کہ بابوجی نے آکر کہا کہ ہمیں واپس لاہور جانا ہوگا کیونکہ برٹش سرکار نے حکم دیا ہے کہ بابوجی چوبیس گھنٹے کے اندر اندر

صوبہ سرحد سے چلے جائیں۔ بادشاہ خاں کا ہنستا ہوا چہرہ ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہا۔

بعد میں کئی مرتبہ بادشاہ خاں سے ملاقات بھی ہوئی کچھ برس پہلے جب وہ دلّی کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں اپنا علاج کرانے کے لیے بھرتی ہوئے تھے تب بھی میں انھیں ملنے گئی تھی۔ اتنے بوڑھے اور بیمار ہو جانے کے بعد بھی بادشاہ خاں کی ہنسی میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا، حالانکہ وہ موجودہ سیاسی حالات سے بے خوش اور بیزار تھے اور انھوں نے کبھی اپنی بیزاری کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

بادشاہ خاں کا نام لیتے ہی میرے ذہن میں فوراً محمد یونس صاحب کا نام آتا ہے جنھیں ہم بچے لاہور میں ایک نوجوان سرگرم کانگریسی کارکن کے روپ میں جانتے تھے۔ لاہور کے سیاسی حلقوں میں اکثر یونس صاحب کا چرچا رہتا۔ وہ ہمیشہ بے باکی سے گفتگو کرتے۔ لگتا تھا کہ خوف نام کی شے کو وہ جانتے ہی نہیں۔ سبھی انھیں ایک کھرا پٹھان کہتے تھے جو ہمیشہ سچی اور کھری باتیں کہتا ہے۔ یونس صاحب آج بھی اتنے برسوں بعد اسی طرح کے کھرے پٹھان ہیں اور کھری باتیں کہنے کے عادی ہیں۔

جب نوجوان محمد یونس کی شادی پنجاب کے مشہور

عیسائی خاندان کی لڑکی لاج ریلیا رام سے ہوئی تو اس شادی کا کافی چرچا رہا - ہم بچوں کے لیے یہ شادی اس لیے اہمیت رکھتی تھی کہ وہ ہندوستان کی قومی یک جہتی کا جیتا جاگتا ثبوت تھی - ہم لوگ " ہندو مسلم، سکھ عیسائی، آپس میں ہیں بھائی بھائی" کے نعرے تو لگاتے تھے لیکن محمد یونس نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کر کے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ مذہب کی دیواروں کو نہیں مانتے - بہت کم لوگ ایسے تھے جو سیاسی نعروں کو اپنی نجی زندگی میں ثابت کر دکھانے کی ہمت رکھتے تھے - محمد یونس ان لوگوں میں سے ایک ہیں -

بھو کا بہشت ۔ کانگڑہ

میرے بچپن کا ایک بڑا اور اہم حصہ ضلع کانگڑہ میں گزرا ہے ۔ چونکہ میرے والد پرنسپل چھبیل داس نے اپنی تخلیقی سیاسی زندگی کا میدان ضلع کانگڑہ کو چنا تھا، اس لیے ہمارے خاندان کا تعلق بھی کانگڑہ سے بہت گہرا ہو گیا تھا۔ ہم لوگ ہر سال گرمی کی چھٹیاں دھرم شالہ، پالم پور، کانگڑہ، مرینڈا، بیجروالا میں گزارتے تھے۔

اس علاقے میں ہمارے والد کی بہت عزت تھی۔ سبھی لوگ انھیں 'گرو جی' کہتے تھے۔ گرو جی کے شاگردوں سے ہمیں بہت ہی عزت اور پیار ملتا تھا۔ بابو جی نے کانگڑہ پر ایک کتاب لکھی تھی۔ "بھو کا سورگ" (بھو کا بہشت) جس میں بہت ہی دلچسپ انداز سے اس بات کا جائزہ لیا گیا تھا کہ کس طرح یہ علاقہ قدرتی خزانوں سے بھرپور ہے، لیکن پھر بھی وہاں غریبی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ غریبی، شہنشاہیت پسندوں کی خون چوسنے کی علامت

ہے۔

مرینڈا کے مہاشے بشن داس جی کا ذکر تو میں پہلے کر چکی ہوں جو ہمارے خاندان کا اٹوٹ حصہ بن چکے تھے۔

کانگڑہ ہی کے کامریڈ پرس رام کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ یہ جاذب نظر شخصیت والے ہنس مکھ نوجوان بابو جی کو گرو جی کہتے اور ہمارے گھر میں وہ ایک بھائی اور بیٹے کی طرح مانے جاتے تھے۔ جب بھی پرس رام جی آتے، ہم خوشی سے ناچ اٹھتے۔ وہ ہمیں کندھوں پر اٹھا کر کھلاتے۔ ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں سناتے۔ بابو جی ہمیں بتاتے تھے کہ کامریڈ پرس رام بہت پڑھے لکھے نوجوان ہیں اور انھوں نے ملک کی خدمت کرتے رہنے کی قسم کھائی ہے۔ ان کے ساتھ گھنٹوں بابو جی اور بی بی جی کی باتیں ہوتی رہتیں۔ بی بی جی کے ساتھ تو اکثر بحث ہوتی کیونکہ کامریڈ پرس رام کمیونسٹ تھے اور ہماری ماں کٹر کانگریسی۔ لیکن دونوں کی بحث باورچی خانے میں ہوتی۔ پرس رام جی بی بی جی کے ہاتھ کے بنے پراٹھے اور گاجر کا حلوہ بہت پسند کرتے تھے۔

جب کامریڈ پرس رام جی کی شادی ایک بہت ہی انقلابی خیالات کی خوبصورت لڑکی سرلا سے ہوئی تو ہم بچے بہت ہی خوش ہوئے۔ یہ ایک بے مثال شادی تھی جس میں نہ کسی ریت رواج کو مانا گیا تھا اور نہ ہی لین دین کو۔ "گرو جی" سمیت پانچ آدمی کامریڈ پرس رام کی شادی

سرلاجی سے کروا لائے تھے۔

شریمتی سرلا پرس رام شرما جو پہلے پنجاب پھر ہماچل پردیش میں برسوں تک ایم۔ایل۔اے اور وزیر بھی رہیں، آج کل ہماچل پردیش کھادی گرام اُدیوگ بورڈ کی چیرمین ہیں۔ ان میں آج بھی پرانے انقلاب کے جذبات ہیں۔ انھوں نے اپنی تینوں بیٹیوں اور بیٹے کی شادیاں بہت ہی سادگی کے ساتھ کیں۔

آج بھی جب شریمتی سرلا سے ملاقات ہوتی ہے تو کامریڈ پرس رام جی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مجھے اس تاریخی کانفرنس کی بھی یاد آجاتی ہے جو مغربی پنجاب میں لیا نامی شہر میں ہوئی تھی اور جہاں میں اور میری بہن سنتوش بھی گئے تھے اور میں نے وہاں نہ جانے کتنی بار لوگوں کے اصرار پر توڑی کانگریس کا گانا گایا تھا۔

اس لیا (مغربی پنجاب) کانفرنس میں ہمارے ساتھ کامریڈ پرس رام اور سرلاجی بھی گئیں۔ بہت سے لوگ اس کانفرنس میں حصہ لینے ہمارے ساتھ ہی لاہور سے لیا گئے تھے۔ کامریڈ نواب زادہ محمود علی خاں جو مشہور ترقی پسند نوجوان تھے، وہ سکندر حیات خاں کے بھتیجے تھے۔ قد چھ فٹ چار انچ تھا۔ بہت ہی خوبصورت اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ نوجوان محمود جب گاڑی سے باہر نکلتے تو ان کا سر ٹکراتا۔ لیا میں جو جلوس نکلا تھا، وہاں ہم لوگوں کو اونٹوں پر بٹھایا گیا تھا۔ کامریڈ پرس رام اور سرلاجی اور کامریڈ

محمود بھی اونٹوں پر سوار تھے۔ شہر میں جگہ جگہ استقبال کے لیے دروازے سجائے گئے تھے۔ ہر گیٹ کے نیچے سے گزرنے کے لیے محمود صاحب کو جھکنا پڑتا اور میں اور سنتوش کھلکھلا کر ہنس پڑتے۔

نواب زادہ محمود علی خاں مشہور پاکستانی صحافی مظہر علی خاں کے بھائی تھے اور نوجوان ترقی پسند ادیب طارق علی کے چچا تھے۔ نواب زادہ محمود علی خاں کی بیوی ستنام کور خود مشہور مصنفہ ہیں اور لاہور میں ہی رہتی ہیں۔ لاہور سے لیا جاتے ہوئے سارے راستے کامریڈ پرس رام جی ہمیں دلچسپ انقلابی کہانیاں سناتے گئے تھے۔ انقلاب اُن کے خون میں بھرا تھا۔ اس لیے انھوں نے اپنی پہلی بیٹی کا نام رکھا تھا دِپلو۔ دپلو بھی آج کل عملی سیاست میں حصہ لے رہی ہیں۔ ان کے خاوند ہرنام سنگھ ٹھاکر، منالی (کانگڑہ) میں ماؤنٹیئرنگ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہیں۔

کانگڑہ کا نام لیتے ہی میری آنکھوں کے سامنے دھرم شالہ کے پنڈت بھگت رام جی، امرناتھ جی سود اور کرشن پوری کے چہرے آجاتے ہیں۔ ہم لوگ جب بھی لاہور سے دھرم شالہ آتے، ان لوگوں کا یہی اصرار ہوتا کہ ہم ان کے گھر میں ٹھہریں۔ پنڈت بھگت رام جی تو سالوں تک ایم۔ ایل۔ اے رہے۔ اور بعد میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم کے وقت جب ہمارا خاندان ایک قافلہ میں پٹھان کوٹ آیا اور وہاں سے دھرم شالہ پہنچا

تو ہم کافی دن پنڈت بھگت رام کے گھر بھی ٹھہرے تھے۔ ان کے گھر والوں سے ہمیں بہت شفقت ملی۔

دھرم شالہ میں ہمارے بابوجی کے ایک بہت ہی جگری دوست امرناتھ سود صاحب تھے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہم دھرم شالہ آئے تو سود صاحب نے کہا کہ ہم بے دھڑک ان کے گھر رہیں۔ ہم پانچ افراد بابوجی، ہم تین بہنیں اور بھائی - سود صاحب کی کوٹھی میں پانچ مہینے رہے۔ ہمارے پاس نہ بستر تھے اور نہ ہی پہننے کے لیے کافی کپڑے۔ ہماری ماں لاہور ہی میں تھیں - ہمارا گھر لاجپت رائے بھون شرنارتھی کیمپ بن چکا تھا اور بی بی جی اس کی انچارج تھیں - ان کا کہنا تھا کہ میں لاہور کی ایم - ایل - اے ہوں - اپنے لوگوں کو اس طرح چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ہم لوگ دھرم شالہ میں تھے - لاہور میں فساد کی خبریں ملتیں - ہم سبھی بی بی جی کے لیے فکرمند تھے - ہم تینوں بہنیں اکثر بیٹھ کر اپنی ماں کو یاد کر کے رویا کرتی تھیں۔

ادھر مسز سود اور ان کی دونوں بیٹیاں اوشا اور اوما ہمیں بہت پیار دیتیں - ہر چیز کا خیال رکھتیں - دھرم شالہ میں بھی فرقہ وارانہ فساد ہو رہے تھے - کئی روز تک سبزی تک کی دکان نہیں کھلی تھی - سود صاحب کے گھر اپنی مرغیاں تھیں - ان کے انڈے بھی ہوتے تھے - لیکن ہم لوگ شاکا ہاری تھے - اس لیے مسز سود گھر ہی میں لگی لوکی اور ہری توری کو طرح طرح سے پکاتیں تاکہ ہم ڈھنگ سے کھانا

کھا سکیں۔ ان کا وہ بے حد پیار اور ہمدردی ہم آسانی سے بھول نہیں پائیں گے۔

شری کرشن پوری کا دھرم شالہ میں مٹی کے تیل کا ڈپو تھا۔ وہ شدید عملی سیاسی کارکن تھے۔ وہ ہمارے بابوجی کی بہت عزت کرنے والوں میں تھے۔ دکان کے اوپر ہی ان کا مکان تھا۔ ان کی ماں اور بیوی بے حد سیدھی سادی خاتون تھیں۔ انھیں سیاست کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ لیکن ہمارے خاندان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ ہمیں ان کے گھر جانا اور ان سے بات چیت کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔

شری کرشن پوری کے متعلق ہمارے والد صاحب ہمیشہ یہی کہتے کہ یہی دوسری جنگ عظیم کی شروعات کرنے والا ہے اور اسے ختم کرنے والا بھی۔ ہوا یہ تھا کہ جس دن یعنی ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی، اس دن ہم لوگ دھرم شالہ میں تھے۔ شری کرشن پوری نے ہی آکر بابوجی سے کہا تھا کہ "گروجی جنگ شروع ہو گئی۔"

جب اگست ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تب بھی ہم دھرم شالہ ہی میں تھے۔ اس دن بھی شری کرشن پوری نے آکر خبر دی تھی: "لو گروجی آج جنگ ختم ہو گئی۔ لگتا ہے اب ہمیں آزادی جلد مل جائے گی۔"

ہمارے والد صاحب کو کانگڑہ سے اس لیے پیار تھا کیونکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ وہ علاقہ ہے جہاں قدرتی حسن کے ساتھ ساتھ لوگوں کا ضمیر بھی بہت خوبصورت ہے۔ کانگڑہ کے لوگ سیدھے سادے اور

بھولے بھالے ہیں - لیکن ان کو بری طرح سے کمزور کیا گیا ہے ۔ اس لیے جب وہاں جگہ جگہ اپنی تقریریں کرتے، تو وہ بہت سیدھی سادی زبان میں ہوتیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں آجاتیں ۔ ہمارے بابو جی کی یہ دلیل عام لوگوں کو بڑی اچھی لگتی کہ سمجھ میں نہیں آتا، لڑائی تو انگریزوں اور جرمنوں کے بیچ ہے اور جوان بھرتی کیے جائیں کانگڑہ کے گانو سے ۔

ایک مرتبہ جب ہمارے والد صاحب اپنی تقریر میں سامراجی طاقت سے ٹکر لینے کی باتیں کر رہے تھے کہ کس طرح گاندھی جی نے "انگریزو بھارت چھوڑو" کا نعرہ دیا ہے تو بہت سی بوڑھی عورتیں بھی وہاں بیٹھی تقریر سن رہی تھیں ۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ایک بوڑھی عورت میرے والد صاحب کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بیٹا مجھے یہ بتاؤ کہ مہاتما گاندھی کے پاس کتنی فوج ہے جس سے وہ انگریزوں کی بڑی طاقت سے ٹکر لے رہا ہے ۔

ہمارے والد صاحب نے اس بوڑھی ماں کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ جنگ آزادی کس طرح لڑی جا رہی ہے لیکن بابو جی کا کہنا ہے کہ بوڑھی ماں کو یقین نہیں ہوا کہ کبھی نہتے لوگ صرف نعرے لگا کر، جلسے کر کے، جیلیں بھر کر اتنی بڑی غیر ملکی طاقت کو شکست دے سکتے ہیں جس کے پاس بھاری فوجی طاقت ہے ۔ وہ میرے والد صاحب جیسے لوگوں کو دیوانہ اور سر پھرا سمجھتی ہونگی ۔

کانگڑہ کا ذکر کرتے ہوئے کامریڈ رام چندر جی کا ہمیشہ ہنستا ہوا چہرہ سامنے آجاتا ہے ۔ انھیں ہم آج بھی چاچا جی کہتے ہیں اور ان کے خاندان کے سبھی لوگوں ۔

بیٹوں — میکھویر، نردویر، ارن ویر، کرم ویر، اندو دونوں بیٹیوں کرانتی اور
شبیرا کو ہم نے اپنے خاندان سے کبھی الگ نہیں سمجھا۔ ہمیں کبھی احساس
اور یقین نہیں ہوا کہ کامریڈ رام چندر ہمارے والد صاحب کے سگے
بھائی نہیں ہیں۔ کامریڈ رام چندر جی کے چھوٹے بھائی بنسی لال جی بھی
ہمارے خاندان کے بہت نزدیکی فرد تھے۔ وہ لاہور میں رٹز سینما کے
منیجر تھے۔ ویسے تو ہم بچوں کو فلمیں نہیں دکھائی جاتی تھیں، لیکن رٹز سینما
میں لگنے والی سبھی مذہبی فلمیں ہم بار بار دیکھ سکتے تھے۔ سنتوش اور
میں نے "بھرت ملاپ" اور "رام راجیہ" جیسی مذہبی فلمیں پانچ بار دیکھی
تھیں۔ ان کے ڈائلاگ اور گانے ہمیں زبانی یاد ہو چکے تھے۔

کامریڈ رام چندر جی، کانگڑہ کی نورپور نام کی جگہ کے رہنے والے
ہیں، لیکن انھوں نے اپنی جوانی کا ایک بڑا حصہ جیلوں میں ہی کاٹا ہے۔
ہندوستان کی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ ہندوستانی
نوجوان سبھا جیسے انقلابی ادارے کو بنانے والوں میں سے ہیں۔ اور
بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو جیسے انقلابیوں کے ساتھ رہے
ہیں۔

چاچا جی (کامریڈ رام چندر) کی کتاب "روڈ ٹو فریڈم" (آزادی کا
راستہ) جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی ہے ہندوستانی تاریخ آزادی کی اچھی
کتابوں میں سے ایک ہے۔ رام چندر جی کے پاس جنگ آزادی کی
یادوں کا خزانہ ہے اس سے ایک نہیں بہت سی کتابیں بن سکتی ہیں اور

نئی نسل کے پڑھنے والوں کو جنگ آزادی کے متعلق جانکاری دے سکتی ہیں۔ ہندوستانی نوجوان سبھا کے متعلق ان کی کتاب جلد ہی شائع ہونے والی ہے

کامریڈ رام چندر جی نے جس طرح اسّی سال کی عمر میں بھی "نیشنل آرکائیوز" میں گھنٹوں بیٹھ کر اپنی کتابوں کے لیے مواد جمع کیا ہے، اس سے بہت سے نوجوان مصنّفوں کو حوصلہ اور ترغیب مل سکتی ہے نیشنل کالج لاہور میں انقلابیوں کے ساتھ انقلاب کا سبق پڑھتے ہوئے کامریڈ رام چندر، جو آج ۱۹۸۲ء میں بھی بہت فخر کے ساتھ اپنے نام کے ساتھ بی۔اے (نیشنل) لگاتے ہیں، اسّی سال سے بھی زیادہ عمر میں ایک نوجوان انقلابی کی طرح آزاد ہندوستان کی تعمیر میں اپنا تعاون دے رہے ہیں۔ ان کا یہی کہنا ہے کہ وہ ان کتابوں سے پیسہ کمانا نہیں چاہتے بلکہ آج کے نوجوانوں کو بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان نے آزادی کتنی محنت اور قربانی دے کر حاصل کی ہے۔

کانگڑہ سے تعلق رکھنے والے متعدد اشخاص ایسے ہیں جن کا ذکر کیا جا سکتا ہے، لیکن ان سب کا نام گنوانا تو شاید اس کتاب میں ممکن نہ ہو، پھر بھی میں ان سب کی احسان مند ہوں کہ انھوں نے ہمارے خاندان کو اتنی عزت اور پیار دیا۔ مجھے یاد ہے کہ کانگڑہ ضلع میں ہم لوگ کہیں بھی جا کر ٹھہرتے، گرو جی، کا کوئی نہ کوئی چیلہ وہاں ضرور نکل آتا۔ ۱۹۲۷ء دسمبر میں ہم بیج ناتھ سے گزر رہے تھے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہمارے ساتھ

تھے۔ موٹر کا پہیا خراب ہوگیا۔ سوال تھا کہ رات کہاں گزاریں گے؟ اسی وقت وہاں سے ڈپٹی کمشنر گزرے جو ہمارے بابوجی کے دوستوں میں سے تھے۔ فوراً ہمیں لے جاکر اپنے ایک دوست کے مکان پر ٹھہرایا۔ اگلے روز موٹر ٹھیک ہوئی تو ہم لوگ آگے چلے۔

ہم لوگ تو چاہتے تھے کہ ہم دھرم شالہ ہی میں مستقل طور پر رہنے لگیں، لیکن ہماری ماں جالندھر میں رہنا چاہتی تھیں اس لیے ہم لوگ دھرم شالہ سے امرتسر آکر رہے اور پھر جالندھر میں رہنے لگے۔ وہیں سے ہماری ماں نے ۱۹۵۲ء میں ودھان سبھا کا انتخاب لڑا اور کامیاب ہوئیں۔ اس کے بعد بھی ہمارا کانگڑہ میں آنے جانے کا سلسلہ جاری رہا۔ دھرم شالہ جاکر بچپن کی بہت سی یادیں تازہ ہوجاتی ہیں۔ ہم ہمیشہ ان یادوں کو بنائے رکھنا چاہتے ہیں۔

سیتا دیوی پنجاب اسمبلی میں

جس دن ہماری ماں نے پنجاب اسمبلی کے ممبر کے روپ میں حلف اٹھایا، وہ ہمارے لیے بےحد خوشی اور جوش کا دن تھا۔ رات بھر ہمیں اس انتظار میں نیند نہ آئی کہ صبح جاکر پنجاب کے اسمبلی ہال میں اپنی ماں کو بیٹھتے ہوئے دیکھیں گے۔ اس کے بعد پھر ایسے مواقع کئی بار آئے، ہماری ماں تقسیم کے بعد پنجاب اسمبلی اور بعد میں پنجاب کونسل کی ممبر رہیں اور ۱۹۷۲ء میں راجیہ سبھا کی ممبر بھی چنی گئیں لیکن جو جوش ہمارے دلوں میں اس وقت تھا جب وہ اسمبلی کی ممبر بنی تھیں، ویسا احساس بعد میں کبھی نہیں ہوا۔

بی بی جی ہمیشہ ہی جہاں سرگرمی سے سیاسی کام کرتی رہیں وہاں انھوں نے سماجی کام بھی کیے اور آریہ سماج کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بی بی جی اور ہمارے بابوجی میں اکثر آریہ سماج کے موجودہ رول کو لے کر بحث ہوتی لیکن دونوں اس بات پر ضرور متفق

رہتے کہ ہندوستانی عورتوں کی سماجی ترقی اور تعلیم کے لیے آریہ سماج
نے جو بھی کام کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے۔ ہمارے مرحوم نانا
اچاریہ رام دیو نے تو لڑکیوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد بنا
لیا تھا اور اسے پورا کرنے کے لیے بہت کام بھی کیا۔ انھوں نے
اپنی سگی بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ ہماری بڑی خالہ سوشیلا ڈاکٹر
تھیں۔ ہماری ماں اور اُن کی چھوٹی بہنوں نے ایم۔ اے تک تعلیم حاصل
کی تھی۔

جب پنجاب اسمبلی میں ہندو کوڈ بل پیش ہوا تو اسے لے کر
سارے ملک میں ہندو رجعت پسندوں نے طوفان کھڑا کر دیا۔ ہندو
مہاسبھا اس طوفان میں سب سے آگے تھی۔ انھوں نے جگہ جگہ
جلسے کر کے عام لوگوں میں غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی کہ ہندو
کوڈ بل ہندو عورتوں کو غیر اخلاقی راستے پر لے جا رہا ہے اور
اس کے پاس ہو جانے سے ہندو خاندان اور ہندو سماج ٹوٹ
کر رہ جائیں گے۔ اَن پڑھ، سیدھی سادی عورتیں اس پروپیگنڈے
سے متاثر ہو کر ان تمام جلسوں اور مظاہروں میں شامل ہوتیں۔
جن کا مقصد ہندو کوڈ بل کی مخالفت کرنا تھا۔

لاہور میں مال روڈ پر زمزمہ توپ کے سامنے بنی بلڈنگ
میں جب ہندو کوڈ بل سے متعلق ایک جلسہ میں ہماری ماں تقریر کر رہی
تھیں تو باہر ہزاروں لوگ "ہندو کوڈ بل مردہ باد" "سیتا دیوی مردہ باد"

کے نعرے لگا رہے تھے۔ بعض لیڈر تو یہ نعرے بھی لگا رہے تھے کہ "ہندو کوڈ بل کا مقصد کیا ہے؟ ہندو عورتوں کو بدچلن اور غیر مہذب بنانا۔" ہم بچے ایک طرف کھڑے اس سارے مظاہرے کو دیکھ رہے ہیں۔ چونکہ بار بار نعروں میں ہماری ماں کا نام آرہا تھا، اس لیے ہم خود کو بہت اہم محسوس کر رہے تھے۔

جونہی جلسہ ختم ہوا، مظاہرین نے ہماری ماں کو گھیر لیا۔ "سیتا دیوی ہائے ہائے" کے ساتھ یہ آوازیں بھی آنے لگیں "سیتا دیوی چاہتی ہے کہ ایک ایک عورت کے سات سات خاوند ہوں۔ عورتیں ڈائنیں بن کر اپنے بھائیوں کو کھا جائیں"۔ اس وقت تو خیر ہم ان نعروں کا مزہ لے رہے تھے لیکن بعد میں ہماری ماں نے ہمیں بتایا کہ یہ نعرے اس لیے لگائے جا رہے تھے کیونکہ ہندو کوڈ بل میں طلاق کی گنجائش رکھی گئی تھی اور لڑکیوں کو اپنے والد کی جائداد میں بھائیوں کے برابر حصہ دیا گیا تھا۔ اسی لیے رجعت پسند عناصر عورتوں کو غلط ڈھنگ سے پھسلا کر ان سے ایسے نعرے لگوا رہے تھے۔

جب بی بی جی باہر آئیں تو انھوں نے زمزمہ توپ جنھیں بھنگیوں والی توپ کہا جاتا تھا، کے اوپر کھڑے ہو کر اپنی تقریر میں یہی کہا کہ ماؤں، بہنو اور بچیو! یہ لوگ آپ کو آپ کے حقوق سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور اسی لیے یہاں غلط قسم کا پروپیگنڈہ کر رہے

ہیں - جوں جوں، بی بی جی بولتی جاتیں، نعروں کا طوفان بھی بڑھتا جاتا - یہ سلسلہ کوئی ایک گھنٹے تک چلتا رہا، تب کچھ لوگوں نے یہ بہتر سمجھا کہ بی بی جی کو مظاہرین کے پنجے سے نکالا جائے کیونکہ وہ ان پر حملہ کر رہے تھے - کچھ عورتوں نے غصّہ سے ہماری ماں کی ساڑی کو پھاڑ ڈالا تھا اور ان کے بال نوچنے شروع کر دیے تھے - بعد میں جب بھی ہم اس واقعے کا ذکر کرتے تو ہماری ماں یہی کہتیں کہ ہندوستانی سماج میں عورتوں کے ان کے حقوق دلوانے کے لیے نہ جانے کتنی بار اپنے بال اسی طرح سے نُچوانے ہوں گے اور اسی طرح ہائے ہائے اور مُردہ باد کے نعرے سُننے ہوں گے -

جب تک ہماری ماں زندہ رہیں، انھوں نے عورتوں کی بہتری کے کام کیے - سیاسی کام کے مقابلے میں اُن کاموں کو ہمیشہ ترجیح دی - ہم لوگ لاہور سے ہی اس بات کے عادی ہو چکے تھے کہ دن ہو یا رات، کسی وقت بھی ہمارے دروازے کھٹکھٹائے جا سکتے ہیں، کھٹکھٹانے والوں میں اکثریت عورتوں کی رہتی - وہ رو رو کر یہی کہتیں کہ بی بی جی ہماری مدد کرو اکثر عورتوں کا دُکھ یہی ہوتا کیونکہ خاوند یا سسرال والے اُن سے بُرا سلوک کرتے ہیں - ہماری دادی یہی کہا کرتیں کہ ہر دکھیاری سیتا دیوی کے پاس ہی چلی آتی ہے -

جالندھر میں ہی ہمارے گھر کے دروازے کبھی رات کو بارہ بجے سے پہلے بند نہیں کیے گئے - ۱۹۷۲ء میں جب ہماری ماں کا

انتقال ہوا تب بھی اس کے بعد مہینوں تک ان کے گھر کے دروازے اسی طرح کھٹکھٹائے جاتے رہے اور عورتیں اسی طرح دہائی دیتی رہیں۔ "بی بی جی ہماری مدد کرو۔"

ہماری ماں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ۔۔۔ وہ اسمبلی کی ممبر ہوتے ہوئے بھی اپنا بہت سا وقت عورتوں کی بہتری کے لیے کام کرنے میں ہی صرف کریں گی۔ لیکن تقسیم سے پہلے کی پنجاب کی اسمبلی میں وہ بہت دیر تک اس کے لیے کام نہیں کر پائیں کیونکہ تقسیم کے بادل پنجاب پر چھانے لگے تھے اور پنجاب فرقہ پرستی کے شعلوں میں جلنے لگا تھا اور ایک لمبے عرصے تک ہماری ماں کو مہاجرین کو امداد دینے کے کام میں لگنا پڑا۔

ہم نے فرقہ وارانہ فساد کی باتیں سنی تھیں لیکن فسادوں کو آنکھوں سے دیکھا نہ تھا پہلی بار فرقہ وارانہ فساد کی جھلک ہمیں کوئٹہ میں دیکھنے کو ملی ہم لوگ اگست ۱۹۴۷ء میں کوئٹہ (بلوچستان) گئے تھے۔ وہاں آریہ سماج کا جلسہ تھا اور ہماری ماں کو اس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر بلایا گیا تھا۔ یہ جلسہ پورے پانچ دن تک چلتا رہا تھا۔ ہماری سب سے چھوٹی خالہ ارندتی کوئٹہ میں رہتی تھیں۔ ہمارے خالو ڈاکٹر سوم پرکاش کھنہ کوئٹہ ہی میں میڈیکل پریکٹس کرتے تھے۔

کوئٹہ بہت ہی پیارا سا شہر تھا۔ اگست کے مہینے میں بھی

وہاں راتیں اتنی ٹھنڈی ہوتی تھیں کہ باہر رکھا پانی جم جاتا تھا۔ ان دنوں کوئٹہ میں انگور سیب کی بہار تھی۔ بہترین قسم کے انگور چھ سے آٹھ آنے سیر ملتا تھا۔ کوئٹہ کے آس پاس دور دور تک سیبوں کے بڑے بڑے باغیچے تھے۔ میں نے پہلی بار وہیں انگوروں کی بیلوں کو دیکھا تھا۔ جہاں انگور کے خوشے ہوتے ہیں، وہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچنی چاہیے۔ وہاں پیٹ کے بل رینگ کر انگوروں سے لدی بیلوں تک پہنچا جا سکتا تھا۔

آریہ سماج کا جلسہ تو خیر اچھی طرح سے ہو گیا۔ لیکن کچھ دن بعد کوئٹہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے۔ ہندوؤں میں بڑی تعداد سندھیوں کی تھی، ڈر کے مارے کوئٹہ اور سندھ کے بڑے شہر چھوڑ کر بھاگنے لگے۔

فسادوں کی وجہ سے کوئٹہ میں انگور بے حد سستا ہو گیا۔ انگور بیچنے والے ریڑھیاں بھر کر انگور بیچتے پھرتے۔ بہترین انگور دو آنے سیر بکنے لگا۔ وہ ریل گاڑیاں بھی کچھ دن نہیں چلیں جن میں انگور بھر کر کوئٹہ سے باہر جاتا تھا۔ سارے کوئٹہ میں انگوروں کی بھرمار ہو گئی۔ ہماری خالہ کا گھر بھی انگوروں سے بھرا پڑا تھا۔ ہمارے بابوجی جنہیں پھل کھانے کا بہت شوق تھا، ہم سے یہی کہتے، کھانا مت کھاؤ، پیٹ بھر کر انگور کھا لو۔ ادھر انگوروں سے ہماری یہ گت اس قدر بھر گئی تھی کہ ہم روتے اور چلاتے کہ انگوروں سے ہماری توبہ۔ یہ ہمیں اچھے نہیں لگتے۔

اس کے بعد ہم نے برسوں تک انگور نہیں کھائے انہیں دیکھ کر کوئٹہ کے انگوروں کے ڈھیر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ پھر فرقہ دارانہ فسادوں کا تعلق بھی جیسے ان یادوں کے ساتھ جڑ گیا تھا۔ انگوروں کو دیکھتے ہی فساد یاد آجاتے۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ انگور بیچنے والے چلا چلا کر یہی کہتے "چمن کا انگور لے لو، چمن کا انگور" لیکن کوئٹہ سے کچھ ہی دور واقع چمن، چمن نہیں ویرانہ تھا۔ وہاں پر انگور نہیں اُگتے تھے۔ سارا انگور کوئٹہ میں ہوتا تھا۔ چمن تو ریل گاڑی کا وہ آخری اسٹیشن تھا۔ جہاں پر برف بنانے کے کارخانے تھے۔ وہیں سے گاڑیوں میں برف بھر کر اور انہیں انگوروں سے لاد کر باہر بھیجا جاتا تھا۔

فرقہ واریت کے بھڑکتے شعلے

ہم لوگ ستمبر میں لاہور واپس آئے تو ماحول بدلا ہوا تھا۔ ایک عجیب قسم کی گھٹن اور تناؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ ادھر ہندوستان کو آزادی ملنے کی تحریک تیز ہونے لگی تھی تو دوسری جانب مسلم لیگ نے بھی جلوس نکالنے شروع کر دیے تھے جس میں اپنے لیے ایک الگ ملک پاکستان کے مطالبے کو جوش کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ ہم لاجپت رائے بھون کے بچے بہت خوش تھے کیونکہ ہمیں ہر طرح کے جلسے جلوسوں اور مظاہروں کو دیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ہم بچوں نے یہ مان لیا تھا کہ ہر قسم کے سیاسی جلوس دیکھنا ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ان جلوسوں کو دیکھ کر ہم اس طرح سے خوش ہوتے تھے جیسے بچے کھلونوں اور کھیل تماشوں کو دیکھ کر اکثر خوش ہوتے ہیں۔ ہماری یہی کوشش رہتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بڑا جلوس نکلے اور ہم اسے دیکھنے سے محروم رہ جائیں۔ لیکن اب جو جلوس نکل رہے تھے اور مظاہرے ہو رہے تھے ان سے

ہمیں اس بات کا احساس بھی ہو رہا تھا کہ کوئی بھاری طوفان آنے والا ہے۔ لیکن ہمارے ننھے دماغوں میں یہ کبھی خیال نہ آیا تھا کہ یہ طوفان اتنا خوفناک ہوگا کہ ہمیں مجبور ہو کر اپنے پیارے لاجپت رائے بھون اور اپنے لاہور کو چھوڑنا ہوگا۔

پھر یہ خوفناک آندھی چل ہی پڑی ۔ لاجپت رائے بھون کی ایک جانب ڈی۔ اے۔ وی کالج کے لڑکوں کا ہوسٹل تھا۔ مارچ ۱۹۴۷ء کو ایک دن لوئیر مال پر گول باغ کے سامنے اس ہوسٹل میں رہنے والے طالب علموں کا لیگ کے جلوس کے مظاہرین کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ ہندو اور مسلم طالب علموں نے ایک دوسرے پر پتھراؤ اور اینٹیں پھینکیں۔ پولیس نے فساد کرنے والے ان طالب علموں کا پیچھا کیا کیونکہ وہ پولیس پر بھی پتھر پھینک رہے تھے۔ طالب علم ہوسٹل کے اندر آ گئے ۔ ہوسٹل کا بڑا گیٹ بند کر لیا اور اوپر چھت پر جا کر پولیس پر اینٹیں پھینکنے لگے۔ جس طرح اینٹوں کی بوچھار ہو رہی تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہ اینٹیں پہلے ہی سے وہاں جمع کر لی گئی تھیں۔

پولیس نے گولیاں چلانی شروع کیں۔ ہم لوگ بھی سارا نظارہ اپنے گھروں کی کھڑکیوں سے دیکھ رہے تھے۔ میری بہن سنتوش اور میں نے اوپر چھت پر جا کر اس نظارے کو اور اچھے ڈھنگ سے دیکھنا چاہا۔ پولیس والوں نے ہمیں دیکھ کر چلّا کر کہا "سب لوگ اندر جائیں۔ نہیں تو ہم آپ کو بھی گولی مار دیں گے۔" جب پولیس نے گولیاں

برسائیں تو پانچ طالب علم زخمی ہوئے اور ایک کی وہیں پر موت ہو گئی۔ یہ دیکھ کر لاجپت رائے بھون میں سبھی لوگ کہنے لگے اب یہ فساد نہیں رکیں گے۔ میری بہن سنتوش اور میں ایک کھڑکی سے سارا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ اس دن ہم بہت پریشان تھے کیونکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے اس نوجوان طالب علم کو پولیس کی گولی لگنے کے بعد مرتے دیکھا تھا۔

اِدھر لاہور میں گرمی بڑھ رہی تھی اور اُدھر ہر روز فرقہ وارانہ فسادوں کی خبریں جگہ جگہ سے ملنی شروع ہو گئی تھیں۔ رپورٹوں سے پتہ چلتا کہ ان فسادوں میں اگر ایک جگہ مسلمان ہندوؤں سے زیادہ طاقتور ثابت ہوئے تو دوسری جگہ ہندو، مسلمانوں کا خون بہاتے۔ راولپنڈی سے خوفناک قسم کے ہندو مسلم فسادوں کی خبریں آنی شروع ہوئیں۔ ایک دن ہم نے ایک لال رنگ کی کتاب لاجپت رائے بھون میں آنے والے ایک شخص کے ہاتھ میں دیکھی۔ نام تھا "ریپ آف راولپنڈی" بعد میں ہمارے بابوجی نے ہمیں بتایا کہ اس کتاب میں راولپنڈی میں ہوئے ہندو مسلمان فسادوں کا پورا ذکر ہے۔ ہم بچے جانتے تھے کہ ان فرقہ وارانہ فسادوں میں ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور دوسرے سبھی مذہب کے لوگوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔

ہمارے پڑوس میں بشریٰ بلقیس اور خورشید رہتی تھیں۔ وہ ہماری دوست تھیں۔ ہم لوگ اکثر ایک ساتھ سیر کرنے جاتے تھے اور

دنیا بھر کی باتیں کرتے تھے ۔ ہم بچوں نے ایک دوسرے کے مذہب کو کبھی برا نہیں کہا کیونکہ ہم لاجپت رائے بھون کے کانگریسی بچے مذہب کی دیواروں میں یقین ہی نہیں رکھتے تھے ۔ ہمیں تو ملک کی آزادی کے لیے ایک ساتھ لڑنا ہی مذہب دکھائی دیتا تھا، ہم لوگ گھر میں نہ انڈا کھاتے تھے اور نہ گوشت، اس لیے بشریٰ، خورشید اور بلقیس بھی ہمارے سامنے گوشت کا نام نہیں لیتی تھیں ۔

لیکن ہم نے محسوس کیا کہ جب سے لاہور میں فرقہ وارانہ فسادوں کے شعلے بھڑکنے لگے تھے ہم بچوں کے درمیان بھی ایک کشیدگی سی پیدا ہونے لگی تھی ۔ خود لاجپت رائے بھون کے بچے ہم سے کہتے کہ ہم بشریٰ کے گھر نہ جائیں ۔ کچھ ہی دنوں میں طرح طرح کی افواہیں اڑنے لگیں ۔ بہت سے لوگ ہمیں آکر جھوٹ موٹ کہتے کہ بشریٰ اور بلقیس کے گھر تو چھرے تیز ہو رہے ہیں اور وہاں بہت سے لوگوں کا جماؤ ہو رہا ہے ۔ مجھے اور سنتوش کو یہ یقین تھا کہ ہماری اچھی سہیلیاں بشریٰ، خورشید اور بلقیس ہمیں کبھی نقصان نہیں پہنچا سکتیں ۔ چونکہ ہماری دادی بھی ہمیں ان کے گھر جانے سے منع کرتی تھیں اور ہم ان سے بہت جھگڑا کرتے تھے لیکن کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اپنی دادی کی بات ماننی ہی پڑتی ۔

ایک دن دکان پر بشریٰ مل گئی ۔ کہنے لگی کہ گھر کے نوکر کہتے ہیں کہ لاجپت رائے بھون میں ہندو مسلمانوں کو مارنے کی تیاریاں کر رہے

ہیں، وہاں پر جھمگھٹے جمع ہو رہے ہیں۔ بشریٰ اور خورشید کی دادی بھی انہیں ہمارے گھر آنے سے روکتی تھیں۔ ہم خوب کھلکھلا کر ہنسنے لگے کہ بعض لوگ اور خاص طور پر ہماری دادیاں کتنی نادان ہیں۔ ہم بچوں کو یقین تھا کہ یہ وقتی طوفان ہے، گزر جائے گا۔ ہمارا ننھا دماغ تو ان فسادوں کے متعلق اتنا سیدھا سادہ رویہ اپنائے ہوا تھا کہ ہم ڈرتے نہ تھے اور بے خوف ادھر ادھر گھومتے رہتے تھے۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ فرقہ وارانہ فساد ہماری زندگی کو کسی بھی طرح سے متاثر کر سکتے ہیں۔

حالانکہ لاہور میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی لیکن پھر بھی ہمارے بابو جی نے ہمیشہ کی طرح میری بہن سنتوش مجھے اور چھوٹے بھائی اشوک کو لارنس گارڈن کی سیر پر چلنے کو کہا۔ لارنس گارڈن بہت اچھا لگتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی لاہور کا چڑیا گھر بھی تھا۔ وہاں کے جانوروں کو ہم بار بار دیکھنا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے اود بلاؤ نظر آتا تھا۔ اس کے تالاب میں پیسے پھینکتے ہی وہ پیسوں کو ڈبکی لگا کر نکال لاتا۔ یہ کھیل ہمیں بہت اچھا لگتا تھا۔ اسی اود بلاؤ کو دیکھنے کے لالچ میں ہم تینوں بھائی بہن بابو جی کے ساتھ چل پڑے۔

ساری مال روڈ سنسان پڑی تھی۔ کہیں کہیں کوئی اِکّا دُکّا راہ گیر چلتا نظر آتا تھا۔ نیلے گنبد کے پاس، جہاں سے انارکلی بازار شروع ہوتا تھا، ہمارے بابو جی کا ایک دوست ملا، کہنے لگا، نسبت روڈ پر

بھاری فساد ہو گیا ہے، آپ آگے نہ جائیں۔ ہم بچے تو فساد کی بات سن کر ڈر گئے لیکن ہمارے بابوجی ہنس کر کہنے لگے "ہم لوگ نسبت روڈ پر نہیں جا رہے ہیں۔ چڑیا گھر میں کبھی فساد نہیں ہوگا، کیونکہ جانوروں کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ شیر، گلدار، بندر اور بھالو نہ ہندو ہیں اور نہ ہی مسلمان۔"

سنتوش، اشوک اور میں اپنے بابوجی کی یہ بات سُن کر ہنسے تو لیکن ہم ڈرے ہوئے تھے اور آگے نہیں جانا چاہتے تھے۔ ہمارے بابوجی ہنس رہے تھے اور ہمیں آگے چلنے کو کہہ رہے تھے۔ جب میں نے اور سنتوش نے ان سے کہا کہ واپس گھر چلیں تو وہ بہت ناراض ہوئے ہم آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ڈر کر پیچھے بھی مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے۔ بابوجی نے پہلے گیٹ کے پاس کھڑی ایک بڑی ریڑھی سے کھجوریں خریدیں۔ اس دن ہمارا من کھجوروں میں نہیں لگ رہا تھا۔

مال روڈ سنسان ہوتی جا رہی تھی۔ ہم چلتے چلتے لارنس گارڈن کے کونے تک پہنچ چکے تھے۔ چڑیا گھر میں بس ہم ہی لوگ گھوم رہے تھے۔ اس دن نہ ہمیں اود بلاؤ اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی شیر اور بھالو۔ ہم نے بے دلی سے اپنے پیارے جانوروں کو دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوگ واپس گھر کی طرف لوٹ پڑے۔ ہم تینوں بچے بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ ایک انجانا خوف ہمیں پریشان کر رہا تھا جب گول باغ آ گیا تو ہمیں کچھ راحت ملی۔ سامنے ہی لاہپت رائے بھون نظر آ رہا تھا۔

پھاٹک پر بی بی جی اور بہت سے لوگ پریشانی کی حالت میں کھڑے تھے۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر بابو جی نے پوچھا "کیا ہوا سب خیریت تو ہے؟" یہ سن کر بی بی جی غصے سے بابو جی سے کہنے لگیں "آپ نے بھی کمال کر دیا۔ بچوں کو لے کر فساد کا تماشہ دیکھنے چلے گئے۔" اس پر دونوں میاں بیوی میں بہت تکرار ہوئی۔ بابو جی کہنے لگے خوفزدہ ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مال روڈ اور چڑیا گھر میں کوئی کسی کو نہیں مارتا۔ یہ کہتے ہوئے بابو جی ہنستے بھی جا رہے تھے۔ ان کی ہنسی سے بی بی جی اور بھی غصہ ہو گئیں۔ بابو جی کا جو دوست ہمیں نیلا گنبد کے پاس ملا تھا، وہی بھاگتا ہوا بی بی جی کے پاس آ کر یہ بتا گیا تھا کہ پرنسپل صاحب تینوں بچوں کے ساتھ سیر کرنے جا رہے ہیں۔

اس دن تو ہمارے بابو جی نے بات مذاق میں ٹال دی تھی لیکن اس دن کے بعد ہم لوگ لارنس گارڈن اور چڑیا گھر کی سیر کو کبھی نہیں گئے حالانکہ ہمیں اود بلاؤ اور دوسرے جانوروں کی یاد آتی تھی۔ حالات تیزی سے خراب ہو رہے تھے۔ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں سے فرقہ وارانہ شعلوں کے بھڑکنے کی خبریں مل رہی تھیں۔ ہر روز ہمیں یہی خبریں سنائی دیتیں کہ فلاں جگہ آگ لگ گئی، فلاں جگہ چھروں سے اتنے لوگ مارے گئے۔ فلاں جگہ پر عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کیوں ہو رہا

ہے۔

ہمارے بابوجی ہمیں بتاتے کہ انگریزوں کی پالیسی یہی ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑواؤ اور حکومت کرو۔ آزادی کی جدوجہد جس طرح سے زور پکڑ رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے انگریز ہندوستان کو آزادی تو دیں گے، لیکن جاتے ہوئے اس کے دو ٹکڑے کر جائیں گے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت کے بیج بو دیں گے۔ ایک الگ ملک پاکستان بنے گا۔ لیکن ہم نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد سارے ہندو اور سکھ پنجاب سے چلے جائیں گے اور مسلمان مشرقی پنجاب سے پاکستان میں آجائیں گے۔ ہماری بی بی جی تو ہمیشہ یہی کہتیں کہ پاکستان بن جائے گا تو کیا فرق پڑے گا؟ ہم لوگ تو اپنے لاہور ہی میں رہیں گے۔ لاہور کے لوگوں کی نمائندگی پنجاب اسمبلی میں کرتے ہیں اس لیے لاہور سے جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہماری بی بی جی اور بہت سے دوسرے لوگوں کو پورا یقین تھا کہ پاکستان بننے کے بعد بھی جو جہاں رہنا چاہے گا رہتا رہے گا۔

ہم اسی احساس اور یقین کو لے کر خوشی سے پھول رہے تھے اور یہی کہتے تھے کہ کچھ بھی ہو جائے ہم اپنے پیارے لاہور کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ لیکن چاروں طرف پھیلتی فرقہ وارانہ آگ نے ہمارے یقین اور عقیدے کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا، راولپنڈی

کے پاس ایک چھوٹے سے شہر جنڈ میں ہمارے چچا بھوانی داس رہتے تھے۔ وہ ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان کے طالب علم انھیں بہت پیار کرتے تھے۔ چچا اپنی شکھی زندگی چلا رہے تھے۔ لیکن فساد کی آگ نے انھیں بھی گھیر لیا۔ ایک دن فسادی ان کے گھر آ گئے اور انھوں نے ان کی بیوی اور بچوں کے آنکھوں کے سامنے ان کا قتل کر دیا۔

چچا کا اس طرح سے قتل ہو جانا ہمارے خاندان کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا۔ ان کے قتل کے بعد سے انسانیت پر یقین اٹھنے لگا تھا۔ ان کا قتل ان کے ان طالب علموں نے کیا تھا، جو ان سے پیار کرتے تھے اور چچا انھیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ فرقہ واریت کا یہ وحشی پن ایسا تھا جس نے بچوں کو اپنے والدین کا قتل کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب چچا کے کنبے کو فسادوں کی آگ سے نکال کر لاہور لانا مشکل کام تھا۔ پھر لاہور میں بھی فساد کی آگ بھڑکی ہوئی تھی اس لیے یہی مناسب سمجھا گیا کہ وہ دلّی چلے جائیں۔

ہمارے بہت سے رشتہ داروں، دوستوں اور واقفوں نے بگڑتے حالات کو دیکھتے ہوئے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ بہت سے لوگ ہمارے والدین کو بھی کہتے کہ وہ لاہور میں نہ رہیں لیکن بی بی جی کسی بھی شرط پر لاہور چھوڑنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کا بار بار یہی کہنا تھا کہ اپنے لوگوں کو چھوڑ کر میں کہاں چلی جاؤں؟

لاجپت رائے بھون مہاجرین کا کیمپ بن چکا تھا۔ سیکڑوں لوگ اپنے گھر چھوڑ کر اسے محفوظ جگہ سمجھ کر یہاں آ گئے تھے۔ یہاں پر فوج کا پہرا تھا۔ سارا دن فوجی ٹرک، فساد کی آگ میں جلتے ہوئے علاقوں میں پہنچ کر وہاں پھنسے لوگوں کو نکال کر یہاں لے کر آتے تھے، پھر یہاں سے لوگ مہاجرین کے قافلوں میں شامل ہو کر آگے چل دیتے۔

بی بی جی اس کیمپ کی انچارج تھیں۔ وہ سارا دن ان علاقوں میں گھومتی رہتیں جہاں فساد ہو رہے تھے۔ جن عورتوں کو فسادیوں میں اغوا کیا گیا تھا، انھیں فسادیوں کے پنجے سے نکال کر لانے کا کام بہت مشکل تھا۔ بی بی جی اسی کام میں لگی تھیں۔ کئی بار تو رات کو بھی گھر نہ لوٹتیں، ہم بچے رات رات بھر اپنی ماں کا انتظار کرتے۔ لاجپت رائے بھون میں رہنے والے اور وہاں آکر پناہ لینے والے مہاجر ہر وقت بی بی جی کی ہمّت اور حوصلے کی تعریف کرتے۔ وہ کسی بھی خطرے سے گھبراتی نہیں تھیں۔

کئی بار میں فوجی جیپ میں بیٹھ کر بی بی جی کے ساتھ ان علاقوں میں گئی جہاں فساد ہو رہے تھے۔ میری ننھی آنکھوں نے بار بار دیکھا کہ کس طرح انسان انسان کا لہو بہا رہا تھا، کس طرح انسان کی زندگی سستی چیز بن چکی تھی جسے پل بھر میں ختم کیا جا سکتا تھا۔ ایک دن اسی طرح گوال منڈی کے علاقے سے ڈھیروں گھائل لوگوں کو لے کر ایک ٹرک میو اسپتال پہنچا تو ایک دوسرا ٹرک آکر وہاں رکا جو انسانی لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹرک نے آکر ان انسانوں کو ایسے پلٹا جیسے وہ گاجر مولیاں ہوں، بالکل اس طرح جیسے منڈیوں

ین الٹا دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ میو اسپتال کے ٹھنڈے کمرے میں جہاں پہلے ہی انسانوں کی لاشیں بھری پڑی تھیں، وہیں پر انہیں بھی ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر لگا کر رکھ دیا گیا۔ جب یہ انسان زندہ تھے تو ان کا مذہب تھا، لیکن اب لاشوں کا کوئی مذہب نہیں رہ گیا تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان، مُردوں کے ان ڈھیروں میں مذہب کی تمام دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔

آج بھی لاشوں کے اس ڈھیر کے متعلق سوچتی ہوں تو کانپ اٹھتی ہوں لیکن اس دن، اس وقت سارے ماحول میں اس طرح دہشت پھیلی ہوئی تھی کہ مجھے لاشوں کے درمیان کھڑے ہو کر بھی ڈر نہیں لگا۔

ایک دن یہی ٹرک لے کر ہم گوال منڈی گئے۔ وہاں ہمارے چچا گوپال کرشن کو بی بی جی نے بہت سمجھایا کہ وہ لاجپت رائے بھون میں آجائیں تو انھوں نے ہنس کر یہی جواب دیا تھا "بھابی جی اتنے لوگوں کو لاجپت رائے بھون میں رکھا جا سکتا ہے؟ اگر ہماری قسمت میں اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کے ہاتھوں مرنا لکھا ہے تو ہم اسے بدل نہیں سکتے۔" ہمارے چچا اپنی ضد کے پکے تھے اور ان سے بحث کرنا بیکار تھا۔ وہ ہمارے ساتھ نہیں آئے۔ لیکن ستمبر ۱۹۴۷ء میں ایک دن ان کے ایک پڑوسی نے فون کیا تھا کہ ماسٹر جی بیمار پڑے ہیں (چچا گوپال کرشن کا اپنا اسکول تھا اس لیے سب انھیں ماسٹر جی کہتے تھے) تب بی بی جی جاکر انھیں ساتھ لے آئی تھیں۔ انھوں نے بعد میں مہینوں تک بی بی جی کی

دیکھ بھال کی اپنے ہاتھ سے ان کے لیے کھانا بنایا کیونکہ بی بی جی گھر میں اکیلی رہ گئی تھیں اور ہم سب لوگوں کو مجبوراً لاہور چھوڑنا پڑا تھا۔

ہماری پیاری نانی جی

ہمارے ماتا پتا دونوں ابھی جیل میں تھے۔ ان دنوں کے دو اہم واقعات ابھی تک مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ہمارے ماما سیتہ بھوشن یوگی، جو اس وقت ہندی کے ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر تھے اور برسوں تک دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں سنسکرت ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ رہے، کی شادی ہو رہی تھی۔ چونکہ میری ماں، نانی جی کی بہت چہیتی بیٹی تھیں اس لیے اُن کی خواہش تو یہی تھی کہ یہ شادی تب ہو جب اُن کی بیٹی جیل سے رہا ہو کر آجائیں، لیکن اس وقت یہ بات یقینی طور سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ رہائی کب ہوگی۔ ہو سکتا تھا کہ برسوں لگ جائیں۔ شادی کے لیے اتنا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجبوراً ہماری نانی شریمتی ودیا دھری نے شادی کا دن مقرر کر لیا۔

شادی ہو جانے کے بعد ہماری نانی جی کی یہ خواہش تھی کہ شادی کی کچھ مٹھائی ان کی بیٹی کو جیل میں پہنچ جائے۔ مجھے یاد ہے انھوں

نے وہ تمام مٹھائی تیار کروائی جو میری ماں کو بہت پسند تھی۔ نانی جی نے جیل کے حکام کے لیے بھی مٹھائیوں کے بہت سے ڈبے تیار کروا دیے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ جیل کے حکام کچھ ٹکڑے ان کی بیٹی تک پہنچا دیں۔

اس دن ملاقات کا دن نہیں تھا۔ لیکن نانی جی مزید پندرہ دن انتظار نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے وہ ساری مٹھائی ایک تانگے میں رکھوائی۔ ہم بھی ساتھ بیٹھے اور ڈیڑھ گھنٹے کا سفر طے کر کے ہم زنانہ سنٹرل جیل پہنچ گئے۔ وہاں پانچ گھنٹوں تک جیل کے حکام نے، جن میں سپرنٹنڈنٹ سے لے کر باہر کا چوکیدار بھی شامل تھا، ہماری نانی کے ساتھ جس طرح کا بُرا سلوک کیا اور انھیں جس طرح سے بے عزت کیا وہ منظر میں زندگی بھر نہیں بھلا سکتی۔ پہلے تو چار گھنٹے تک چوکیدار نے اکڑتے ہوئے یہی کہا کہ جیل سپرنٹنڈنٹ مشغول ہیں، وہ کسی سے نہیں مل سکتیں۔ باہر چلچلاتی دھوپ تھی۔ وہیں پر ہم لوگ ایک پیڑ کے سائے میں بیٹھے رہے۔

میری بہن سنتوش اور مجھے بار بار نانی جی پر غصہ آرہا تھا کہ وہ بی بی جی کو مٹھائی دینے کے لیے اتنی بے عزتی کیوں برداشت کر رہی ہیں۔ ہم انھیں کہتے "نانی جی چلیے لوٹ چلیں۔ چوکیدار ہمیں جیل سپرنٹنڈنٹ سے نہیں ملنے دیتا، ہم اس کے سر پر اینٹ

تو مار سکتے ہیں، اسے گالیاں تو دے سکتے ہیں، اس سے اپنی بے عزتی کا بدلہ تو لے سکتے ہیں ۔" لیکن نانی جی کو بس ایک دھن تھی اور وہ یہ کہ کسی طرح مٹھائی ان کی لاڈلی بیٹی سیتا دیوی تک پہنچ جائے۔ سنتوش نے نانی جی سے کہا تھا کہ اگر بی جی کو پتہ چل گیا کہ اس مٹھائی کی وجہ سے آپ کی کتنی بے عزتی ہوئی ہے اور کتنے دھکّے کھانے پڑے ہیں تو وہ مٹھائی کو چھوئیں گی بھی نہیں۔ ہماری نانی جی بہت نرم دل عورت تھیں۔ جیل کے سامنے پیڑ کے سائے میں بیٹھی مسلسل روتی جا رہی تھیں۔ سنتوش اور مجھے بار بار جھڑکتیں اور کہتیں "تم دونوں جب بڑی ہوں گی تو تمہیں پتہ چلے گا کہ ماں کا دل کیا ہوتا ہے ۔"

کوئی چھ گھنٹے کے انتظار کے بعد جیل سپرنٹنڈنٹ مسٹر سوداگر سنگھ نے نانی جی کو اندر بلا لیا۔ اس دن پنجاب کی جیلوں کے انسپکٹر جنرل بھی آئے ہوئے تھے۔ جب مسٹر سوداگر سنگھ نے ان سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ سیاسی قیدی کو مٹھائی بھیجنا چاہتی ہیں تو اس نے غصے سے چلا کر کہا۔" مٹھائی اندر نہیں جا سکتی ۔ انھیں کہیے کہ جیل کے اسٹاف کو بانٹ دیں یا واپس لے جائیں ۔" سنتوش اور میں بہت چھوٹی تھیں، ہماری نانی جی ان کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کر رہی تھیں ۔

سنتوش نے تنک کر کہا" مٹھائی دیکھ لیجیے، اس میں بم

تو نہیں۔ کیا مٹھائی اندر جانے سے انگریزوں کا راج الٹ جائے گا؟
انسپکٹر جنرل نے غصے سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے انگریزی میں
کہا کہ سانپوں کے بچے بھی سانپ ہوتے ہیں۔ ادھر وہ مسز سوداگر
سنگھ کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ہمیں اس
عمر میں زیادہ انگریزی تو نہ آتی تھی لیکن ہم جانتے تھے کہ وہ سیاسی
قیدیوں کے بارے میں ہی باتیں کر رہے ہیں۔ بار بار انسپکٹر
جنرل یہی کہتے۔ "دے آر ویری ہارڈ نٹ ٹو کریک" یعنی انھیں
آسانی سے توڑا نہیں جا سکتا۔

ہم تینوں باہر آ گئے۔ جب ہم باہر نکل ہی رہے تھے تو جیل
کی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ مسز لال مل گئیں۔ انھوں نے نانی جی کو دیکھتے ہی
کہا "ماتا جی آپ کیوں اپنی پاگل کانگریسی بیٹی کے لیے اتنے
دھکے کھاتی ہیں؟" جب نانی جی نے مسز لال سے کہا کہ کیا تھوڑی
سی مٹھائی اندر نہیں بھیجی جا سکتی تو اس نے کہا کہ آپ انتظار کیجیے،
میں ابھی بات کر کے آپ کو بتاؤں گی۔" سنتوش اور میں دونوں
پریشان ہو رہے تھے۔ نہ جانے یہ مٹھائی کا سلسلہ کب ختم ہوگا۔
ہم جانتے تھے کہ ملاقات کا دن نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنی ماں
سے نہیں مل پائیں گے۔ بار بار جب جیل کے پھاٹک کے اندر کی ایک
کھڑکی کھلتی تو ہم جھانک کر دیکھنے کی کوشش کرتے کہ شاید کہیں ہمیں
اپنی ماں یا اور کسی جاننے والے کا چہرہ نظر آ جائے۔ لیکن ایسا نہیں

ہوا - ہم دونوں کو جب بھی بھوک لگتی، مٹھائی نکال کر کھا لیتے - ہم نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا - جتنی مٹھائی سنتوش اور میں نے اس دن جیل کے باہر انتظار کرتے ہوئے کھائی، اتنی زندگی بھر کبھی نہیں کھائی -

شام ہو چکی تھی - ہم نے نانی جی سے کہا کہ چلیے واپس چلیں - مسز لال مٹھائی کبھی اندر نہیں جانے دیں گی - جب نانی جی نے آگے بڑھ کر چوکیدار سے کہا کہ بھائی مسز لال سے پوچھیے کہ کیا ہم اور انتظار کریں یا واپس چلے جائیں ؟ تو جیل کے چوکیدار نے جھلا کر ہماری نانی جی کو دھکا دیا اور وہ پھاٹک کے قریب بنی ایک نالی میں گر گئیں جس میں لوہے اور کانچ کے بہت سے ٹکڑے پڑے تھے - نانی جی کو چوٹیں آئیں - ان کے ایک پانو میں لوہے کا ایک ٹکڑا گھس جانے سے خون بہہ رہا تھا - ہم نے انھیں اٹھایا اور غصے سے کہا کہ ساری مٹھائی اس نالی میں پھینکیے اور گھر چلیے - اتفاق سے ٹھیک اسی وقت مسز لال آ گئیں اور انھوں نے تعجب سے کہا کہ آپ ابھی تک یہاں ہیں - مٹھائی چھوڑ جائیے، ہم دیکھیں گے کہ وہ اندر بھیجی جا سکتی ہے یا نہیں - یہ کہہ کر مسز لال اپنے گھر چلی گئیں جو قریب ہی تھا -

نانی جی نے وہ ساری مٹھائی چوکیدار کو دے دی - ہمیں پکا یقین تھا کہ یہ مٹھائی ہماری ماں تک نہیں پہنچے گی - لیکن اس

وقت ہمیں مٹھائی سے زیادہ خیال اپنی پیاری نانی کی چوٹ کا تھا۔ شام کے وقت جیل روڈ پر تانگہ ملنا مشکل تھا لیکن کسی نہ کسی طرح تانگے میں ہم نانی جی کو لاد کر واپس لاجپت رائے بھون کی طرف چل دیے۔

سارے راستے ماں جی روتی رہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ رونا انھیں اپنے جسمانی زخم کا نہیں بلکہ اس بات کا ہے کہ مٹھائی ان کی بیٹی تک نہیں پہنچ پائے گی۔ پندرہ دن بعد جب ہم ملاقات کے لیے اپنی ماں کے پاس گئے تو نانی جی نے پہلا سوال یہی کیا ــــ "سیتا کیا تجھے کچھ مٹھائی مل گئی یا نہیں؟" بی بی جی نے ہنستے ہوئے بتایا تھا کہ ہمارے مٹھائی چھوڑنے کے چار پانچ دن بعد انھیں مٹھائی کے کچھ ٹکڑے اندر بھجوائے گئے تھے جو سب عورت قیدیوں نے مل کر کھائے۔ میں نے دیکھا نانی جی پھر رو رہی تھیں لیکن یہ آنسو شاید اس خوشی کے آنسو تھے کہ ان کی بیٹی نے کچھ مٹھائی تو آخر کھا ہی لی۔

دوسرا اہم واقعہ اس سے کچھ مہینے بعد ہوا۔ میری بہن سنتوش اور مجھے دونوں کو ہی خسرہ نکلی ہوئی تھی اور ہمیں مسلسل بخار رہنے لگا تھا جس سے ہماری نانی بہت پریشان ہوئیں۔ سنتوش اور میں دونوں کمزور اور چڑچڑے ہوتے چلے جا رہے تھے۔ جیسا کہ میں نے کتاب کے شروع میں لکھا تھا، ہم لوگوں کا علاج لاہور کے بہترین ڈاکٹروں سے ہوتا تھا۔ جب ہم دونوں بہنوں کو خسرہ ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی مسلسل بخار رہنے لگا تو نانی جی نے ہمیں لاہور

کے مشہور ڈاکٹر بھگت رام کو دکھایا۔ کچھ مہینے تک ان کی دوائیں چلتی رہیں لیکن بخار اترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے صلاح دی کہ ہم دونوں کو کسی پہاڑ پر لے جایا جائے اور ہو سکتا ہے ایک لمبے عرصے تک ماں سے بچھڑے رہنے کی وجہ سے جی اداس ہو جسے ہم بچے اپنی بہادری دکھانے کی وجہ سے ظاہر نہ کر رہے ہوں۔ اس لیے ہماری ماں کو پیرول پر رہا کروانے کے لیے بھی درخواست دینی چاہیے۔

خود ڈاکٹر بھگت رام نے بہت ہی پُرزور الفاظ میں یہ لکھ کر دیا کہ ان دونوں بیٹیوں سنتوش اور منورما کا میں کئی مہینوں سے علاج کر رہا ہوں، لیکن ان کی طبیعت ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی میرے خیال میں ان کے ماں باپ دونوں کو پیرول پر رہا کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں۔ ڈاکٹر بھگت رام کے اس خط کے ساتھ ہی پنجاب گورنر کے نام باقاعدہ ایک عرضی ہماری نانی جی کی طرف سے تیار کی گئی جس میں ہمارے ماں باپ کی پیرول پر رہائی کی درخواست کی گئی تھی۔

انگریزی حکومت چاہے لاکھ ظلم ہندوستانیوں پر ڈھا رہی تھی لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی عرضی گورنر کو بھیجی جائے اور اسے پڑھے بغیر کوڑے میں ڈال دیا جائے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت تھا کہ انگریز حکمران ان دنوں کے کانگریسیوں سے بہت خوف کھاتے تھے۔

چونکہ عرضی میں ہماری نانی جی نے گورنر سے ملنے کا وقت طلب کیا تھا اس لیے دس دن بعد ہی وہاں سے جواب آگیا کہ وہ فلاں تاریخ کو گورنر ہاؤس میں آکر ان سے مل سکتی ہیں۔

نانی جی نے ایک بہت سمجھدار، اسمارٹ اور نوجوان کانگریسی ورکر کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کیا جو گورنر سے انگریزی میں بات چیت کر سکے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ بچوں کو بھی ساتھ لے جانا چاہیے۔ پورے آٹھ دن تک ہمارے گھر میں ہی نہیں بلکہ سارے لاجپت رائے بھون میں اسی بات کا ذکر رہا کہ ہماری نانی ہم لوگوں کو لے کر گورنر کے پاس جا رہی ہیں۔

ہماری نانی جی کانگریسی تو نہیں تھیں لیکن وہ ہمیشہ پتلی کھادی کی سفید ساڑی ہی پہنتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب سے ان کی شادی ہمارے نانا جی اچاریہ رام دیو جو آریہ سماج کے ایک اہم ستون تھے، کے ساتھ ہوئی تھی، تبھی سے انھوں نے کھادی پہننا شروع کیا تھا، کیونکہ ہمارے نانا جی ہمیشہ کھادی ہی کی دھوتی کرتا پہنتے تھے۔ اس دن بھی نانی جی نے کھادی کی سفید نیلی کنارے والی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔

ہمیں بتایا گیا تھا کہ انگریز وقت کے بہت پابند ہوتے ہیں اور یہی ایک وجہ ان کی کامیابی کی بھی ہے۔ اس لیے ہمیں گورنر ہاؤس وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی پہنچنا چاہیے۔ صبح گیارہ بجے کا وقت دیا گیا۔ نانی جی ہم بچے اور وہ کانگریسی ورکر پونے گیارہ بجے وہاں پہنچ گئے۔ لارنس

گارڈن کے آخر میں شاندار گورنر ہاؤس تھا۔ جب ہم لوگ وہاں تانگے پر سے اترے تو باہر بیٹھے گارڈ نے ہمیں حقارت سے دیکھا۔ لیکن جب گورنر کے پرائیویٹ سیکرٹری سے مل کر خط کو دکھایا گیا تو ہمیں اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن تانگہ اندر نہیں جانے دیا گیا۔

ان دنوں پنجاب کے گورنر مسٹر میکنانلڈ تھے۔ انگریز گورنر کی شان و شوکت بھی تھی اور طاقت بھی۔ ان کے ملٹری سکریٹری نے جو انگریز تھا، ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا اور ٹھیک گیارہ بجے ہم لوگ گورنر پنجاب کے سامنے ان کے بڑے سے شاندار کمرے میں لے جائے گئے۔ ہمارے ساتھ جانے والے کانگریسی ورکر نے ہم سے کہا تھا کہ گورنر کو گڈ مارننگ کہنے میں اپنی کوئی ہتک نہیں۔ کیونکہ ہم بچے ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ ہم ہر انگریز افسر کی بے عزتی کریں گے اور اس کو بُرا بھلا کہیں گے۔ برٹش قاعدے کے مطابق گورنر نے خود بھی میری ماں جی کو دیکھتے ہوئے گڈ مارننگ کہا اور سیدھا سوال کیا کہ آپ کیا چاہتی ہیں؟ ہمارے ساتھ آئے ورکر جو ترجمان کا کام کر رہے تھے، نے بتایا کہ پرنسپل چھبیل داس اور شریمتی سیتا دیوی دونوں جیل میں ہیں اور ان کی دونوں بچیاں لمبے عرصے سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹر کی صلاح ہے کہ ان کے ماں باپ یا کم سے کم ماں کو کچھ عرصے کے لیے پیرول پر رہا کیا جائے۔

گورنر نے فوراً پوچھا کہ ان کا ڈاکٹر کون ہے۔ ان کے ہاتھ میں

ڈاکٹر بھگت رام کا لکھا ہوا کاغذ تھما دیا گیا۔ چونکہ ڈاکٹر بھگت رام لاہور ہی کے نہیں، پنجاب بھر کے نامی ڈاکٹر تھے اس لیے گورنر نے ان کی لکھی ہوئی تحریر پڑھ کر میری طرف دیکھا اور کہا ـــ "شی ریلی لُکس بِک" (یہ سچ مچ بیمار لگتی ہے)۔ فوراً اپنے ملٹری سکریٹری سے کہا کہ ان کے ماں باپ کو ایک مہینے کی پیرول پر رہا کیا جائے۔ ہماری ماں جی نے فوراً کہا ایک مہینہ بہت تھوڑا ہے۔ بچوں کو پہاڑ پر بھی لے جانا ہے اس پر گورنر نے کچھ سوچ کر کہا ان کی ماں سیتا دیوی کی پیرول دو مہینے کی ہو اور پتا کی ایک مہینے کی۔ ہمارے ساتھ گئے کانگریسی ورکر نے نانی جی سے پنجابی میں کہا اس سے زیادہ بحث کرنا بے کار ہے۔ اب چلیے۔ ساری ملاقات آٹھ منٹ میں ختم ہو گئی اور ہم لوگ واپس باہر کھڑے اپنے تانگے میں آ گئے۔ نانی جی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ انھیں اس بات کی خوشی کی تھی کہ ان کی بیٹی کم سے کم دو مہینے کے لیے جیل سے گھر آئے گی۔

ہمارے لاجپت رائے بھون واپس پہنچنے پر وہاں کے سبھی لوگ جمع ہو گئے، کیونکہ جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہم سب لوگ ایک بڑے خاندان کی طرح رہتے تھے۔ جب انھیں پتہ چلا کہ گورنر نے پیرول کی حامی بھر لی ہے تو لاجپت رائے بھون کے بچے اس طرح سے خوش ہوئے جیسے ان کے اپنے ماں باپ کو پیرول

پر رہائی کے آرڈر ملے ہیں۔

اب ہم ایک ایک لمحہ گننے لگے کہ کب ہمارے ماں باپ پیرول پر رہا ہوں گے اور گھر آئیں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ پیرول پر رہائی کی ساری کارروائیاں پوری ہونے میں کافی وقت لگتا ہے۔ کیونکہ گورنر کے آرڈر ہوم سیکرٹری کے پاس جاتے ہیں اور وہاں سے جیلوں کے انسپکٹر جنرل کے پاس اور پھر متعلقہ جیل میں۔ اس ساری کارروائی میں کم سے کم آٹھ دس دن تو لگنے ہی تھے۔

یہ آٹھ دس دن کا وقت ہم نے بہت بے چینی سے گزارا۔ رات بھر نیند نہیں آتی تھی اور آنکھوں کے سامنے ماں باپ ہی دکھائی دیتے تھے۔ اتنے سالوں میں شاید اتنی بے چینی میں نے پھر کبھی محسوس نہ کی ہو گی۔ لاجپت رائے بھون میں سب بچے ہم سے کہتے اب تو تمہارے ماں باپ کے آنے میں بس اتنے دن رہ گئے ہیں۔

شاید عورتوں کی سینٹرل جیل کو گورنر کے آرڈر، مردوں کی جیل سے دو روز قبل مل گئے تھے اس لیے بی بی جی کی رہائی ہمارے پتاجی سے دو روز قبل ہوئی تھی۔ ہم پھر تانگہ لے کر عورتوں کی جیل پہنچے۔ وہی دربان جیل کے پھاٹک پر کھڑا تھا جس نے ماں جی کو دھکا دیا تھا اور انھیں چوٹ آئی تھی۔ وہی سپرنٹنڈنٹ مسز لال تھیں اور وہی مسز سوداگر سنگھ۔ چونکہ ہم اس دن بہت خوش تھے اس لیے ہمیں ان لوگوں کے لیے بھی اتنی نفرت اور چڑ نہیں تھی جتنی کہ پہلے جیل

آنے پر ہوا کرتی تھی ۔ مسز لال نے نانی جی سے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا ۔
"آپ کی یہ کانگریسی اولاد آپ کو بڑھاپے میں کتنا تنگ کرتی ہے ۔"

کوئی پون گھنٹے کے انتظار کے بعد بی بی جی باہر آئیں ۔ ہم نے جیل کے پھاٹک کی کھڑکی کو کھلتے دیکھا ۔ ساری سیاسی قیدی عورتیں جیسے ایک جلوس کی شکل میں انھیں باہر چھوڑنے آئی ہوں ۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی لڑکی اپنی سہیلیوں سے بچھڑ کر سسرال جا رہی ہو ۔ میں نے بہت سی عورتوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھے لیکن کھڑکی بند ہونے سے پہلے یہ آوازیں بھی سنائی دیں ۔ "سیتا جلدی واپس آجانا ۔"

دو دن بعد جب ہم اپنے پتا جی کو لینے لاہور سینٹرل جیل گئے تو وہاں کا منظر اتنا جذباتی نہ تھا ۔ ہم باہر ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے کہ ہمارے پتا جی اپنا سامان لے کر ہنستے ہوئے باہر آ گئے ۔ پہلے ہمیں پیار کیا اور پھر غصے میں کہا ۔ "کیوں اتنا بیمار ہو جاتے ہو کہ ہمیں پیرول پر رہا ہونا پڑتا ہے ؟" لگتا تھا بابو جی کو جیل سے اس طرح پیرول پر رہا ہونا اچھی بات نہیں لگتی تھی ۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ پیرول پر رہائی کی درخواست دینا برٹش حکومت سے رعایت مانگنا ہے ، جس کے وہ ذرا بھی حق میں نہیں تھے ۔ چونکہ جیل سے لاجپت رائے بھون کا راستہ کافی لمبا تھا اس لیے اس عرصے میں ہم نے بہت سی باتیں بابو جی کو سنا دیں ، جس میں گورنر سے ملاقات بھی شامل تھی اور سی ۔ آئی ۔ ڈی انسپکٹر جگت

سنگھ کو گالیاں دینے اور منہ چڑانے کے قصے بھی ۔ ہم بچے بھی اتنے خود غرض تھے کہ سارے راستے پتاجی سے بات چیت کرتے رہے اور ہمیں خیال ہی نہ آیا کہ ہمارے ماں باپ آپس میں ٹھیک دو سال بعد مل رہے ہیں جب کہ ہم دونوں سے وہ کئی بار مل چکے تھے ۔

اس دن لاجپت رائے بھون میں ہر خاندان بہت خوش تھا ۔ سارے دن ہمارے گھر آنے والوں کا تانتا لگا رہا ۔ ہمارے سارے رشتہ دار جس میں ہمارے چاچا گوپال داس اور بوا سرسوتی دیوی اور اُن کے بچے بھی شامل تھے ، بی بی جی اور بابوجی سے ملنے آئے ۔ ' دے دے ' بھی بہت خوش تھیں کہ ان کا بیٹا جیل سے آیا ہے اور وہ بار بار یہی پوچھتیں کہ کیا تمہیں جیل میں تندور کی روٹی اور اڑد چنے کی کالی دال بھی ملتی تھی یا نہیں ۔ کیونکہ ہمارے پتاجی کو یہ دونوں چیزیں بہت پسند تھیں ۔ اس دن بھی دے دے نے یہی دال پکائی تھی ۔ لیکن انھیں تندور میں بار بار ایندھن ڈالنا پڑ رہا تھا کیونکہ روٹی کھانے والے بہت سے تھے ۔

اسی دن شام کو یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ تین چار دن بعد بی بی جی اور بابوجی ہمیں لے کر کسولی جائیں گے ۔ کسولی پنجاب میں چھوٹا اور پیارا اہل اسٹیشن ہے وہاں پر بابوجی کے دو اچھے دوست اور ہماری ماں کی چچیری بہن بھی رہتی تھیں ۔

کسولی میں بیس روز ہم نے بہت ہنسی خوشی کے ساتھ

گزار دیے۔ دہاں بابوجی کے ساتھ ہم لمبی سیر پر جاتے۔ وہ ہماری مالش بھی کرتے تھے۔ بی بی جی بہت اچھا کھانا بناتی تھیں۔ ہم ہر روز یہی کہتے کہ "دے دے، تم کھانا نہیں بناؤ۔ سنتوکش اور میرا بخار ان دنوں بالکل ٹھیک ہو گیا تھا اور ہم کافی تندرست نظر آنے لگے تھے۔ لیکن ادھر جوں جوں بابوجی کے پیرول کے دن ختم ہونے کے قریب ہوتے جا رہے تھے، ہماری اُداسی بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ جب بابوجی کو لاہور جانا تھا۔

آزادی کا خوفناک انتظار

جیسے جیسے پندرہ اگست کا دن قریب آتا گیا فسادوں کی رفتار تیز ہوتی گئی، انسانوں کا خون اور تیزی سے بہنے لگا۔ ایک تو لاہور میں ویسے ہی اگست کا مہینہ بلا کی گرمی کا ہوتا ہے، اوپر سے جگہ جگہ آگ لگائی جا رہی تھی۔ ہم لاجپت رائے بھون کی بہت اونچی چھت پر پانی کے ٹینک کے اوپر کھڑے ہو کر دیکھتے تو چاروں طرف آگ کے شعلوں کی لالی دکھائی دیتی۔ وہاں سے لوگوں کے چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی سُنائی دیتیں۔ ہم لوگ یہ سب دیکھنے اور سننے کے جیسے عادی ہو گئے تھے۔ ان دنوں ہم بچوں کے پاس بات چیت کا موضوع ایک ہی تھا اور وہ تھا فساد۔ شاید اسی لیے ہم لوگوں کو فسادوں سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

۱۲ اگست ۱۹۴۷ء — لاجپت رائے بھون میں یہ چرچا زوروں سے سنائی دیا کہ یہاں پر جلد ہی حملہ ہونے والا ہے کیونکہ

یہاں پر سیکڑوں لوگ جمع ہیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ لاجپت رائے بھون میں رہنے والی عورتیں اور بچے رات کے وقت ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہوسٹل میں جا کر رہیں گے۔ اور سارے مرد لاجپت رائے بھون کی حفاظت کریں گے۔ یہ سن کر میں نے اور سنتوش نے رونا شروع کر دیا۔ ہم کچھ منٹوں کے لیے بھی اپنے لاجپت رائے بھون کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتے تھے۔ سنتوش نے بار بار بحث کرنے کی کوشش کی کہ جو فسادی ہمیں لاجپت رائے بھون میں مار سکتے ہیں وہ ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہوسٹل میں بھی آ سکتے ہیں، لیکن سبھی کی رائے تھی کہ ڈی۔ اے وی کالج کا ہوسٹل محفوظ جگہ ہے۔ شام ہوتے ہی کھانا کھا کر ہم لوگ ہوسٹل کے اندر چلے جاتے۔ وہاں بھی اوپر کی چھت پر چڑھ کر جگہ جگہ آگ کے شعلے دیکھتے رہتے۔ رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ اس کی وجہ خوف نہیں بلکہ اپنے پیارے لاہور کے جلنے کا ڈر تھا۔ دن بھر ہم فسادوں کی مار کاٹ کی باتیں سنتے اور رات کو آگ کے شعلے دیکھتے۔

آخر ۱۴ اگست کی رات آ ہی گئی۔ رات کے ٹھیک بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی ۱۵ اگست ہو جائے گا —— ہندوستان آزاد ہو جائے گا —— انگریزوں کی حکومت ختم ہو جائے گی —— یونین جیک کی جگہ ہر جگہ ترنگا لہرانے لگے گا۔ اس آزادی کا ہم برسوں سے انتظار کر رہے تھے۔ اسی آزادی کے لیے ہم نے برسوں تک لاہور کی کڑکڑاتی

سردی میں ۲۶ جنوری کے دن صبح پانچ بجے اٹھ کر ترنگا لہرایا تھا۔ اسی آزادی کے لیے ہم چھوٹے بچوں نے سردی کی پروا نہ کرتے ہوئے صبح سویرے کی پربھات پھیریوں میں حصہ لے کر آزادی کے گیت گائے تھے اور نعرے لگائے تھے۔ اسی آزادی کے لیے ہم بچوں نے برسوں تک اپنے والدین کی جدائی سہی تھی۔ وہ جیل جاتے تھے اور ہم انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔ اس آزادی کا ہم برسوں سے سندر سپنا دیکھ رہے تھے۔

آج وہی آزادی ہم ہندوستانیوں کو ملنے والی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں آج پہلی مرتبہ ہمارا دل اداس، دکھی اور پریشان تھا۔ ایک جانب ہم تصور کر رہے تھے کہ دلّی میں کس طرح آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو ترنگا لہرائیں گے۔ لیکن دوسری جانب آگ کی لپٹیں اس دن بہت قریب آچکی تھیں۔ ہمارے پڑوس کے علاقے میں فساد ہو رہے تھے۔ عورتوں کے چیخنے اور بچوں کے چلّانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کبھی "اللہ اکبر" سنائی دیتا، اور کبھی "ہر ہر مہادیو" لیکن دونوں نعرے اکثر ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو جاتے۔ ہم بچوں سے کہا گیا تھا کہ آج ہم چھت پر نہیں جائیں گے۔ چھت پر خطرہ تھا۔ ہوسٹل کے اندر کے حصے میں باورچی خانے کے پیچھے بنے کمرے میں زمین پر بچھی دری پر ہم بہت سے لوگ صبح ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

کبھی کسی نے کہا بارہ بج گئے پندرہ اگست ہو گیا، ہندوستان آزاد ہو گیا۔ سنتوش نے مجھے گلے لگا کر کہا کہ اب ہم غلام نہیں رہے، آزاد ہو گئے۔ ہم دونوں رو رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کمرے میں موجود سبھی لوگ ہچکیاں باندھے رو رہے ہیں۔ ہم سبھی ایک دوسرے کو گلے لگا کر ہکلاتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ آخر ہمیں آزادی مل ہی گئی۔ انگریزوں نے ہندوستان چھوڑ ہی دیا۔ ہمارا دل دکھی تھا کہ ہمارا سپنا پورا نہیں ہوا کہ ہم پندرہ اگست کو آزاد ہندوستانی کی حیثیت میں آزاد ہندوستان میں ترنگا لہرائیں گے، آزادی کا ہنس کر گاتے ہوئے خیر مقدم کریں گے۔

آج تک کوئی بھی موقع ایسا نہیں آیا تھا جب آزادی کا خیر مقدم کرتے ہوئے ہم بچوں نے ترنگا جھنڈا نہ لہرایا ہو اور "آزاد کریں گے ہند، تجھے آزاد" کا گانا گلا پھاڑ کر نہ گایا ہو۔ لیکن آج جب ہمارا پیارا ترنگا سچ مچ آزاد ہندوستان پر لہرا رہا تھا، ہم لوگ ایک اندھیرے کمرے میں ڈرے سہمے بیٹھے تھے۔ ہماری ساری توجہ ان آوازوں پر ٹکی تھی جن میں چیخیں، آنسو اور کراہیں تھیں۔ ان کے ساتھ ہی فسادیوں کی پاگل پن کی آوازیں تھیں — نعرے تھے۔ یہ سب کچھ ہماری آزادی کے ان گیتوں اور نعروں سے کتنے الگ تھے جو ہم برسوں سے لگاتے آئے تھے۔

آج پندرہ اگست کا دن تھا۔ آج ہمیں بیحد خوش ہونا چاہیے

تھا، لیکن آج ہم بہت غمگین تھے۔ ساری رات ڈی۔ اے۔ وی کالج کے ہوسٹل میں جاگ کر اس گھبراہٹ اور پریشانی میں گزری کہ نہ جانے کب فسادیوں کا رخ ہماری طرف ہو جائے۔ صبح لاجپت رائے بھون میں سبھی کے چہرے غمگین دکھائی دے رہے تھے کیونکہ اب یہ بات تقریباً طے شدہ معلوم دیتی تھی کہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اپنے پیارے لاہور کو چھوڑنا پڑے گا۔ آج ہی ملی، ننھی آزادی جیسے ہم آزادی کے دیوانوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔

لاجپت رائے بھون میں رہنے والے دوسرے لوگ وہاں سے جا چکے تھے۔ بی بی جی اور بابو جی نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی لاہور چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلے جانا چاہیے جہاں ہم لوگ حفاظت سے رہ سکیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ بی بی جی لاہور ہی میں رہیں گی۔ وہ کسی بھی شرط پر لاہور چھوڑنے کو تیار نہیں تھیں۔ ہم چاروں بھائی بہن۔ وجے، سنتوش، اشوک اور میں بابو جی کے ساتھ لاہور چھوڑ کر جائیں گے۔ لیکن کہاں؟ یہ وہ سوال تھا جس پر دنوں تک ہمارے گھر میں بحث ہوتی رہی تھی۔

جانا تو وہیں تھا جہاں اپنے رشتے دار اور دوست تھے۔ ہم لوگ دہرادون یا ہردوار نہیں جانا چاہتے تھے کیونکہ ہمیں اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ لاہور چھوڑ کر جہاں بھی جائیں گے، وہاں لمبے عرصے تک رہنا پڑے گا۔ ہمارے والدین یہی کہتے کہ کچھ دیر ہی کی تو بات

ہے، فسادوں کا طوفان رُک جائے گا اور ہم واپس اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ پنجاب کے بہت سے لوگ یہی سوچ کر اپنے گھر چھوڑ گئے تھے اسی لیے بہت سی عورتوں نے تو باقاعدہ کپڑے دھو کر انھیں استری کر کے رکھا تھا۔ رسوئی کے برتنوں کو مانجھ دھو کر ٹکایا تھا۔ گیہوں صاف کر کے آٹا پسوا کر رکھا تھا۔ بچوں کے اسکول کی کاپیاں کتابیں سنبھال کر رکھی گئی تھیں کہ واپس گھر لوٹنے پر جب بچوں کے اسکول جانے کا وقت ہو تو انھیں دقت نہ پیش آئے۔

لیکن آج پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کے دن ہمیں یہ یقین ہو چکا تھا کہ ہمیں اپنے لاہور سے مہاجر بن کر جانا ہوگا۔ بعد میں پنجاب سے آنے والے لوگوں نے جس طرح سخت محنت کر کے خود کو دوبارہ بسا لیا تو لوگوں نے شرنارتھی کہنے کے بجائے پوروشارتھی کہنا شروع کر دیا۔

پتہ چلا تھا کہ فوج کی نگرانی میں مہاجروں کا ایک قافلہ ۲۳ اگست کو لاہور سے پٹھان کوٹ جا رہا ہے اسی قافلے میں ہمیں بھی جانا تھا۔

چونکہ ہمارے بابوجی کا کانگڑا ضلع سے بیحد لگاؤ تھا، اس لیے یہی فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ کانگڑا ہی میں دھرم شالہ جائیں گے۔ ہم اور کہیں جانا بھی نہیں چاہتے تھے۔ ہماری نانی جی ہردوار رہتی تھیں ایک خالہ شکوہ آباد میں، دوسری دہرادون میں اور تیسری دلی میں۔ لیکن ہم ان تینوں جگہوں میں سے کہیں بھی نہیں جانا چاہتے تھے۔ چونکہ ہم ویسے بھی ہر سال دھرم شالہ، پالم پور یا کلو منالی جایا کرتے تھے، اس لیے ہمیں لاہور چھوڑ

کر دمعرم شالہ جانا بُرا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن ہمیں احساس ضرور تھا کہ اس بار ہم مجبوری کی حالت میں دمعرم شالہ جا رہے ہیں اور یہی بات ہمیں بُری لگ رہی تھی۔

اس وقت تو ہمیں یہی یقین تھا کہ ہم کچھ عرصہ کے لیے لاہور چھوڑ رہے ہیں اس لیے ہم نے سوچا کہ اپنی ضرورت کا تھوڑا سامان یعنی پہننے کے کپڑے ہی اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔ لاجپت رائے بھون میں رہنے والے دوسرے لوگ پہلے ہی جا چکے تھے۔ سبھی لوگ اپنے گھر بند کر کے گئے تھے۔ سبھی کو یہ امید تھی کہ خود ہی واپس آکر اپنا گھر کھولیں گے۔

ہماری بہت سی سہیلیاں ایسی تھیں جن کی ماؤں نے جانے سے پہلے گھر کے سبھی کپڑے دھوکر، انھیں استری کر کے رکھا تھا۔ کچھ ایک نے تو جانے سے پہلے گھر کی پوری صفائی کی، تمام برتنوں کو اچھی طرح مانجھ دھوکر ٹکایا۔ ہمارے ٹرنکس میں رہنے والی بی بی جی نے چھت پر سوکھتے ہوئے سارے اُپلے اٹھا کر اپنے گھر کے اسٹور میں بند کر دیے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کچھ دیر بعد جب وہ واپس لوٹیں گے تب انھیں جلانے کے لیے اُپلوں کی ضرورت ہوگی۔ اپنی بھینس کو بھی وہ بطور امانت قلعہ گجر سنگھ میں اپنے ایک مسلمان دوست کے ڈیرے میں چھوڑ آئے تھے۔ ان کے دوست نے یہاں تک کہا تھا کہ اُن کی بھینس کے دودھ کو بیچ کر وہ پیسے جمع کرتا

جائے گا۔ بھینس کو کھلانے کا خرچہ وہ اسی پیسے میں سے نکالے گا اور جب یہ لوگ واپس لاہور لوٹیں گے تو انہیں ان کے پیسے اور بھینس دے دے گا۔ برسوں تک جالندھر میں وہ بی بی اپنی بھینس کا ذکر کرتی رہیں اور اسے یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں۔ اسی طرح میری ایک دوست نے اپنے قیمتی کھلونے میرے پاس بطور امانت رکھ دیے تھے کہ واپس لوٹنے پر وہ کھلونے مجھ سے لے لے گی۔

اب سوال یہ تھا کہ اپنے ساتھ کیا لے جائیں۔ چونکہ ہم قافلہ بنا کر لاہور چھوڑ رہے تھے اس لیے فوج کا حکم تھا کہ ہم اپنے ساتھ سامان نہیں لے جا سکتے۔ محض ایک درمیانی سائز کا بکس رکھنے کی اجازت دی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایک بکس میں ہم پانچ افراد کے کتنے کپڑے آ سکتے تھے؟ چونکہ ہم لوگ کھادی کے کپڑے پہنتے تھے اس لیے یہ کپڑے جگہ بھی زیادہ گھیرتے تھے۔

ہم لوگوں کے پاس ڈھیروں کھلونے تھے۔ ہم لوگ اکثر کھلونے خریدتے رہتے جس میں مٹی کے کھلونوں کی تعداد زیادہ رہی۔ ہماری نانی ہوشیارپور اور جالندھر سے ہمارے لیے گڑیاں لاتیں۔ کچھ گڑیاں ایسی تھیں جنھوں نے اپنی گود میں ننھے بچے اٹھا رکھے تھے۔ ہمارے پاس گڑیوں کا ایک بڑا سا گھر بھی تھا۔ ہم نے اپنی گڑیوں کے لیے بہت سے کپڑے بنائے تھے۔ چونکہ ہم کھادی پہنتے تھے اس لیے ہماری گڑیوں کے پاس بھی کھادی کے اور خالص ریشمی کپڑے تھے۔

ان کے کپڑوں پر گوٹا کناری بھی لگے ہوئے تھے۔

ہمارے بابوجی نے غصّے سے کہہ دیا تھا کہ ہم اپنا کوئی بھی کھلونا ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ جب ہم ہچکی باندھ کر روتے تو بابوجی ہمیں تسلی دیتے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ مہینے میں لاہور واپس آجائیں گے۔ سنتوش اور میں اکثر ایک دوسرے سے یہی پوچھتے کہ کیا ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم لاہور کبھی واپس نہ آسکیں؟ ہمارا دل پریشان تھا۔ ہم ڈرتے تھے لیکن دل کو دلاسا دے رہے تھے کہ ہم جلدی واپس لوٹ آئیں گے۔ پھر ہمیں اس بات کی تسلّی بھی تھی کہ ہم اپنا گھر بند نہیں کر رہے تھے۔ بی بی جی تو گھر ہی میں رہنے والی تھیں۔

یہ فیصلہ ہو گیا کہ ۲۲ر اگست کو صبح چار بجے مہاجرین کا یہ قافلہ چلے گا۔ ایک بس میں ہمارے لیے پانچ سیٹیں رکھوا دی گئی تھیں۔ قافلہ ہمارے گھر کے پاس سے ہی یعنی گول باغ کے سامنے سے شروع ہونے والا تھا۔ پورے تین دن تک میں اپنے سبھی کھلونوں سے باری باری کھیلتی رہی۔ ہر کھلونے کو بار بار پیار کیا اور خود کو یہ تسلّی دی کہ ہم بہت جلدی ان کے پاس لوٹ آئیں گے۔

اپنے سبھی کھلونوں میں سے مجھے تالی بجاتا بندر بہت اچھا لگتا تھا۔ کھلونے بنانے والے نے بندر کا جسم ہرے رنگ کا بنایا تھا اس کے دونوں ہاتھ لال تھے اور منہ بھی لال۔ مجھے لگا کہ میرے جانے کے بعد یہ بندر اُداس ہو جائے گا اور روتا رہے گا ہیں کسی بھی حالت میں

اپنے اس پیارے بندر کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ میں نے وہ بندر بکس میں کپڑوں کے ٹھیک نیچے رکھ دیا۔ برسوں تک وہ بندر میرے پاس رہا، حالانکہ اس کی مٹی جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھی۔

نومبر ۱۹۵۷ء میں جب میں اپنے مغربی ایشیا کے پہلے دورے کے دوران پاکستان گئی تو لاہور میں، میں نے سب سے پہلے لاجپت رائے بھون کا رخ کیا۔ تب لاجپت رائے بھون ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے پاس تھا۔ بھاگتی ہوئی اپنے گھر پہنچی۔ بڑے سے کمرے میں الماری خاموش کھڑی تھی۔ وہ خالی تھی۔ اسی الماری میں میں نے اور سنتوش نے اپنے سارے کھلونے قرینے سے سجا کر بند کیے تھے۔ میں کافی دیر تک اس خالی الماری کے سامنے کھڑی رہی۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے سارے کھلونے زندہ ہو اٹھے۔ آج سوچتی ہوں کہ کتنا اچھا ہوتا اگر میں اس خالی الماری کو نہ دیکھتی۔ کم سے کم ان لاکھوں بچوں کی طرح جو اپنے کھلونے اپنی اپنی الماریوں میں سنبھال کر رکھ آئے تھے شاید میرے تصور میں بھی میرے یہ کھلونے ہمیشہ زندہ رہتے۔

ہم جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہمارا گھر ان بہت سے لوگوں کے سامان سے بھرا ہوا تھا جیسے بہت سے لوگ محفوظ جگہ سمجھ کر لاہور چھوڑتے وقت ہمارے گھر چھوڑ گئے تھے۔ ہماری بی بی جی ان سے بار بار کہتیں کہ کس کی ذمّے داری پر سامان چھوڑ رہے

ہو تو ہر ایک کا جواب یہی ہوتا کہ اگر خدا کی مرضی ہو گی تو ہمارا سامان ہمیں مل جائے گا۔

بی بی جی نے لوگوں کا یہ سامان ایک فوجی ٹرک میں اس وقت لاہور سے امرتسر بھیجا جب وہ خود لاہور چھوڑنے پر مجبور ہوئیں۔ پتہ نہیں لوگوں کو ان کا سامان ملا یا نہیں لیکن دو لوہے کے ٹوٹے سے بکس جن پر پہچان کے لیے بی بی جی نے لال سیاہی سے اپنا نام لکھ دیا تھا، امرتسر کے مہاجر کیمپ میں محفوظ رہے تھے اور ہمارے گھر آ گئے تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ان بکسوں کا مالک کون ہے۔ بعد میں جب ہم لوگ جالندھر رہنے لگے تو برسوں بعد ان کے مالکوں نے آکر ہم سے وہ بکس لیے۔

قصہ کتنا فلمی معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاندان فسادوں میں مغربی پنجاب کے کسی شہر سے لاہور آتا ہے۔ مہاجرین کے قافلے میں مشکل سے ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی جاتی ہے۔ خاوند کو تیز بخار ہے۔ بیوی اُسے اور تین بچوں کو مشکل سے سنبھالتی ہے۔ قافلہ چلنے لگا تو وہ دو بکس ہماری ماں کو دے جاتی ہے۔ بکسوں پر سفید چاک سے اپنا نام لکھتی ہے جو دھکوں میں مٹ جاتا ہے۔

جب ہم لوگ جالندھر میں رہنے لگتے ہیں تو بی بی جی پنجاب کے بہت سے اخباروں میں اشتہار چھپواتی ہیں کہ جن لوگوں نے ان کے پاس اپنے دو بکس چھوڑے تھے، وہ آکر انھیں لے جائیں۔

کوئی نہیں آتا - آٹھ سال بیت جاتے ہیں - وہ دونوں بکس اسی طرح امانت بنے ہمارے گھر میں پڑے رہتے ہیں - ایک بار پھر اشتہار پنجابی اردو اور ہندی کے اخباروں میں دیا جاتا ہے - ایک مہینے بعد رات دس بجے ہمارے دروازے پر ایک بوڑھی عورت اور اس کا خاوند آتے ہیں - ان کے ہاتھ میں اخبار میں چھپا وہ اشتہار کا ٹکڑا ہے - بی بی جی کو دیکھتے ہی کہتے ہیں کہ ۲ ستمبر ۱۹۴۷ء کو لاہور میں ہم ہی نے آپ کو دو بکس دیے تھے -

ستم ظریفی دیکھیے کہ پنجاب میں بٹالہ کے قریب رہنے والے گاؤں میں یہ لوگ جب بازار میں نمک خریدتے ہیں تو دکاندار اخبار کے جس کاغذ میں انہیں نمک دیتا ہے اسی ٹکڑے میں ان کے بکسوں کے متعلق اشتہار چھپا ہے - وہ دونوں میاں بیوی فوراً بس میں بیٹھ کر جالندھر آتے ہیں اور جب انہیں دونوں بکس دکھائے جاتے ہیں تو وہ دونوں خوشی کے مارے زور زور سے رونے لگتے ہیں - ہماری بی بی جی ان سے پوچھتی ہیں کہ وہ بتائیں کہ ان بکسوں میں کیا کیا چیزیں ہیں؟ وہ عورت روتے ہوئے بولنا شروع کرتی ہے کہ ایک بکس میں سب سے اوپر لال رنگ کی ساٹن کا شلوار کرتا ہے جو اس کی شادی کا جوڑا ہے اور اس کے نیچے دو گرم شالیں ہیں - اس کے نیچے فلاں فلاں کپڑے اور سب سے نیچے نیلے رنگ کے کپڑے میں بندھے سونے کے آٹھ ڈھیلے ہیں جن کا وزن چالیس تولے سے زیادہ ہوگا -

اسی طرح دوسرے بکس میں اپنے ہاتھوں سے رکھی ہر چیز کی تفصیل ان لوگوں نے بتادی جب تالے توڑ کر بکسوں کو کھولا گیا تو ان کی تمام چیزیں جوں کی توں رکھی مل گئیں وہ لوگ ہماری بی بی جی کی تعریف کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ سیتا دیوی کا تو سونے کا بُت بننا چاہیے۔ ان جیسے لاکھوں انسان آج تک اپنی ان تمام چیزوں کو یاد کرتے ہیں جو وہ اپنے بکسوں اور الماریوں میں قرینے سے رکھ آئے تھے۔ انھیں یہی امید تھی کہ فرقہ وارانہ فسادوں کا طوفان رک جائے گا اور وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ آج تک بہت سے بوڑھے ایسے ہیں جن کے پاس اپنے گھروں، اپنے بکسوں اور اپنی الماریوں کی چابیاں محفوظ ہیں۔ یہ تمام چیزیں وہ مہاجرین کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئے تھے۔

اب مہاجرین کے اسی قافلے کا بھی ذکر ہو جائے جس میں ہم لوگ ۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور سے پٹھان کوٹ کی طرف چلے تھے۔ ۲۲ر اگست کی رات کو ہم سو نہیں سکے تھے۔ صبح چار بجے قافلہ روانہ ہونا تھا سنتوکش اور میں رات بھر روتے رہے تھے۔ کبھی ایک کمرے میں جاتے کبھی دوسرے میں، اور کبھی اپنے گھر کی چھت پر۔ ہمارے ساتھ لے جانے کے لیے بہت سا کھانا تیار ہوا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ لوگ کب اور کس جگہ رُکیں گے۔

لاجپت رائے بھون میں رہنے والی گُڑیا 'بھولی' نے ایک...

مہینہ پہلے چار پلّے دیے تھے ۔ ان میں سے ایک پلّہ بالکل سفید رنگ کا تھا۔ میں نے اس کا نام موتی رکھا تھا ۔ اس کی خوبصورت آنکھیں بڑے بڑے موتیوں کی طرح لگتی تھیں ۔ ننھا موتی جب بھاگتا تو بیحد پیارا لگتا ۔ سنتوش اور میں جانتے تھے کہ ہم کبھی بھی اپنے موتی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے ۔ رات بھر ہم موتی کو گود میں اٹھائے گھومتے رہے ۔ جب قافلے میں شامل ہونے کا وقت آیا تو میں نے اپنے گھر کے پیچھے ایک خاندان، جو سرگودھا سے آیا تھا اور لاہور میں اپنے چھوٹے بھائی اور اس کے بچوں کا انتظار کر رہا تھا، کی بیٹی راج کو جگا کر کہا کہ ہم جا رہے ہیں تم موتی کا دھیان رکھنا ۔ جب امرتسر میں میری ملاقات راج اور اس کے گھر والوں سے ہوئی تو پہلا سوال میں نے موتی کے بارے میں ہی پوچھا ۔ اس نے کہا کہ ہمارے جانے کے دو دن بعد میں وہ ایک فوجی ٹرک کے نیچے کچل گیا تھا ۔ اپنے موتی کی آنکھوں کو میں اتنے سالوں میں بھی نہیں بھلا پائی ہوں ۔

ہم چاروں بھائی بہنوں نے جب اپنا گھر چھوڑا تو ہم تینوں بہنیں تو رو رہی تھیں لیکن اشوک بہت چھوٹا تھا، اس لیے وہ مست تھا ۔ بار بار یہی کہتا کہ روتی کیوں ہو ۔ ہم ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی جا رہے ہیں، جلد ہی واپس آ جائیں گے ۔ اس قافلے میں بہت سی بسیں اور فوجی ٹرک تھے ۔ میں اور سنتوش بس میں بیٹھنے کو ٹالتے

جا رہے تھے۔ بابو جی نے غصے سے کہا کہ ساری جگہ چھن جائے گی، اپنی سیٹوں پر بیٹھ جاؤ۔ ہزاروں لوگ جمع تھے جگہ کے لیے چھینا جھپٹی ہو رہی تھی۔ بند بسوں میں لوگوں کے کھڑے ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ فوجی، لوگوں کو بسوں کی چھتوں پر نہیں بیٹھنے دے رہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ چاروں طرف فسادوں کی آگ ہے۔ اس قافلے پر بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ فوج چھت پر بیٹھے لوگوں کی گارنٹی نہیں لے سکتی۔

قافلہ چل پڑا۔ ہم نے اپنے پیارے لاجپت رائے بھون۔ اپنے گول باغ، جہاں ہمارا سارا بچپن بیتا تھا، لالہ لاجپت رائے کا بُت جہاں ہر روز، صبح شام جانا ہماری عادت بن چکی تھی، عجائب گھر جس پر ہمیں ناز تھا اور اپنی پیاری زمزمہ توپ کو الوداع کہا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے لارنس گارڈن اور چڑیا گھر کے سبھی جانوروں کے چہرے آ گئے۔ انار کلی اور مال روڈ آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ جوں جوں قافلہ بڑھتا جاتا تھا، ہماری سسکیوں کی رفتار بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ راستے میں جو جو جگہیں آتی گئیں، میں اور سنتوش ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہتے گئے ـــ

مہاجرین کا یہ قافلہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جگہ جگہ مار کاٹ ہو رہی تھی۔ لوگوں کے بھاگنے اور چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں آگ کے شعلے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ دیر

بعد شالی مار باغ سامنے آیا تو ہم نے حسرت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اس کی پھولوں بھری کیاریاں اور پانی سے بھرے خوبصورت تالاب آ گئے۔ کیونکہ شالی مار باغ ہمارے گھر سے کافی دور تھا اس لیے ہم یہاں زیادہ نہیں آپاتے تھے، لیکن جب کبھی کوئی مہمان لاہور آتا تب اسے شالی مار باغ دکھانے ضرور لے جاتے۔ کھانے پینے کا سامان ساتھ ہوتا۔ چٹائیاں اور دریاں بھی ہوتیں۔ تب سارا دن شالی مار باغ میں ہی گزارا جاتا۔ یہاں کچھ ایسی کشش تھی کہ ہم بار بار وہاں جانا چاہتے تھے۔

شالی مار باغ سے ذرا آگے جا کر قافلہ رک گیا۔ دو نوجوان لڑکیاں چیختی ہوئی بھاگ رہی تھیں۔ اُن کے پیچھے دس بارہ غنڈے بھاگ رہے تھے۔ لڑکیوں کے کپڑے پھٹے ہوئے اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ چلا رہی تھیں "بچاؤ بچاؤ" راستہ سنسان نہیں تھا، صبح ہو چکی تھی۔ آس پاس کافی لوگ دکھائی دیتے تھے، لیکن ہم نے کسی کو بھی ان دونوں لڑکیوں کو بچاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو لوگ ان کے پیچھے بھاگ رہے تھے ان کا مذہب وحشی پن اور درندگی ہی دکھائی دیتا تھا۔ ان لڑکیوں کی آنکھوں میں بے چارگی اور بے بسی جھلک رہی تھی۔

میری سمجھ میں تب بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ ہر دنگا فساد ہوتے

ہی خود کو مہذب کہنے والے انسان اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت پر کیوں حملہ کر دیتے ہیں؟ ہم ہندوستانی جو اپنے متعلق یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے کہ ہمارے ملک میں عورتوں کی بہت عزت کی جاتی ہے، ہم نے اپنے سماج میں عورت کو بہت اونچا درجہ دیا ہے، ہم مغربی ملکوں کی طرح عورتوں کو اشتہاری شے نہیں سمجھتے، لیکن ہندوستانی سماج میں عورتوں کی عزت کی اصلی جھلک فرقہ وارانہ فسادوں کے دوران ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو سانجھی عزت کہنے والے لوگ کس بے رحمی سے اس سانجھی عزت کی بوٹیاں نوچتے ہیں۔ اپنے ہی بھائیوں، اور بیٹوں سے بے عزت ہونے والی دو سانجھی بیٹیوں کی بے بس آنکھیں مجھے ہمیشہ پریشان کرتی رہیں گی۔ نہ جانے ان فرقہ وارانہ فسادوں میں اسی طرح کتنی عورتوں نے بے بسی کے آنسو بہائے ہوں گے۔ ان آنسوؤں کے داغ کبھی نہیں دھل سکتے۔

واگہہ کے اُس پار

ہمارا قافلہ پھر رکا۔ "اب کیا ہوا ؟" آواز نہیں آئی "کیا کوئی نیا خطرہ ہے ؟" "نہیں ہم ہندوستان میں داخل ہو رہے ہیں۔ یہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحد واگہہ ہے" "اب سب خطرہ ٹل گیا" ۔ "ہم اپنے ہندوستان میں آگئے۔" یہ سن کر بس میں بیٹھے لوگوں نے "واہ گرو تیرا آسرا" ۔ "بھگوان کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم ہندوستان میں آگئے۔" لیکن ہم تینوں بہنیں پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ ہمیں احساس ہو گیا تھا۔ کہ ہم اپنے وطن — اپنے پیارے لاہور سے بہت دور جا رہے ہیں۔ ہمیں لگا کہ واگہ کے دوسرے پار جاتے ہی ایک جھٹکے سے ہمارا رشتہ اپنے پیارے لاہور سے ٹوٹ گیا ہے۔ یہ کچھ اسی طرح کا احساس تھا جیسا کہ ۱۹۴۲ء میں جیل کی کوٹھری میں جب میں اپنی ماں کے گلے سے چپٹی بیٹھی تھی تو پولیس کی عورتوں نے ایک جھٹکے سے مجھے ماں کی آغوش سے کھینچ لیا تھا۔ آج تک

میں ان دونوں احساسات کو نہیں بھول پائی ہوں - ان کے تصور ہی سے دل اداسیوں کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے -

واگہ کے اس پار جسے ہندوستان کہتے تھے، ہم مہاجروں کا قافلہ جا کر رک گیا - ہم نے سسکیاں بھرتے ہوئے دیکھنا چاہا کہ وہ سرحد کہاں ہے جس نے ایک ملک کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا ہے - اس وقت واگہ پر سرحد کے پھاٹک نہیں لگائے گئے تھے اس لیے ہمیں وہ لاہور سے آنے والی سڑک ہی کا حصہ دکھائی دے رہا تھا - ہمارے ننھے دماغوں کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ انگریزوں نے ایک جگہ واگہ کو ہمارے لاہور اور ہمارے درمیان سرحد بنا کر کھڑا کر دیا تھا -

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جس لاہور میں اپنا گھر تھا ـــ اپنے کھلونے تھے ـــ اپنے آم اور جامن کے پیڑ تھے ـــ اپنی وہ دیواریں تھیں جہاں برسوں تک لکیریں کھینچنے کا کھیل چھپوں چھیچ گنڈیریاں کھیلتے آئے تھے ـــ اپنے وہ آنگن اور چھتیں تھیں جہاں پر ابھی تک ہمارے "کیڑی کاڑے" کے کھیل کے خانے کھنچے ہوئے تھے ـــ اپنی جھاڑیاں تھیں جہاں چور سپاہی کھیلتے ہوئے چھپ جاتے تھے - وہ لاہور جہاں سبھی کچھ اپنا تھا، آج وہ بے گانہ ملک ہو گیا اور ہم اپنے ملک میں مہاجر بنے کھڑے ہیں - چار گھنٹے پہلے ہمارا اپنا سچا سچا یا گھر تھا - چار گھنٹے بعد ہم بے گھر ہو گئے - چاروں طرف

اُداسی کا گہرا اندھیرا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں جائے گا؟ کیا کرے گا؟

کچھ سال بعد جب میں نے سعادت حسن منٹو کا مشہور افسانہ 'ٹوبہ ٹیک سنگھ' پڑھا تو مجھے ایک دم احساس ہوا کہ ہم سبھی مہاجر جو اپنے گھروں کو چھوڑ کر قافلوں میں اپنے "ملک" جا رہے تھے سبھی اس پاگل خانے کے مریض ٹوبہ ٹیک سنگھ کی طرح تھے جو مغربی پنجاب میں ٹوبہ ٹیک سنگھ نام کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لاہور کے پاگل خانے میں اس کا نام ہی ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑ گیا تھا کیونکہ وہ ہر وقت اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام لیتا رہتا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ اس کا ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے' ہندوستان میں یا پاکستان میں؟ اور جب پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا تھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ پاکستان میں ہے تو اس نے ضد پکڑ لی تھی کہ وہ ہندوستان نہیں جائے گا۔ اسے بہلانے کے لیے اس سے بار بار کہا گیا کہ اس کے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو ہندوستان بھیج دیا جائے گا۔

پاگلوں کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا۔ دسمبر کی سردی کا شروع ہو چکی تھی جب واگہ کی سرحد پہ پاگلوں کا تبادلہ ہو رہا تھا تو ٹوبہ ٹیک سنگھ اپنی سوکھی ٹانگیں نے کر اس دائرے پر کھڑا ہو گیا جسے ہندو پاک سرحد کا نام دیا گیا تھا۔ رات بھر پاگلوں کا تبادلہ ہوتا رہا

لیکن ٹوبہ ٹیک سنگھ ویسے ہی کھڑا رہا۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ اس نے چیخ ماری اور گر گیا۔ سب نے دیکھا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سرحد کی اسی لائن پر کھڑا تھا جس کے دونوں طرف ہندوستان اور پاکستان تھے۔ اس کی ٹانگیں اس حصے میں تھیں جسے بھارت کہا گیا تھا، لیکن سر اور دھڑ اسی طرف تھا جسے پاکستان کا نام دیا گیا تھا اور جہاں پاگل ٹوبہ ٹیک سنگھ کا "اپنا ٹوبہ ٹیک سنگھ" تھا۔

جس طرح برسوں تک پاگل ٹوبہ ٹیک سنگھ اپنے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو نہیں بھلا سکا تھا، اسی طرح سرحد پار کرنے والے ہر مہاجر نے اپنے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کو بھی نہیں بھلایا۔ تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب میں "لائل پور کلاتھ ہاؤس" "راولپنڈی سویٹ ہاؤس" — "لاہور مانٹوسری اسکول" قائم ہو گئے اور پاکستانی پنجاب میں "دلی کلاتھ ہاؤس" — "بنارس زری ہاؤس" "لکھنؤ ساڑی شاپ" کی بھرمار ہوئی، آج ملک کی تقسیم کے طویل ۳۷ سینتیس برسوں کے بعد بھی ان مہاجروں سے پوچھیے تو یہی کہیں گے کہ اب جالندھر میں رہتے ہیں لیکن پیچھے لاہور، سرگودھا یا لائل پور سے آئے ہیں۔ "اب کراچی میں ہیں لیکن مراد آباد، لکھنؤ یا دلی سے آئے ہیں"

قسمت کا مذاق دیکھیے کہ دو مہینے پہلے جب میں لاہور گئی تھی تو اپنے لاجپت رائے بھون کو بھی دیکھنے گئی۔ لاجپت رائے بھون

کے بڑے ہال اور اوپر کی منزلوں میں آج کل پنجاب سرکار کے فنگر پرنٹس بیورو کے دفتر ہیں۔ اندر جا کر دیکھنے کے لیے وہاں کے سپرنٹنڈنٹ سے اجازت لی تو انھوں نے بتایا کہ وہ جالندھر کے رہنے والے ہیں۔ ان کا گھر ٹھیک اسی جگہ تھا جہاں ہمارا خاندان تقسیم کے بعد جالندھر آ کر بسا تھا۔ آج بھی ہمارے بابوجی اندر بھائی اشوک وہاں رہتے ہیں۔

لاجپت رائے بھون کے اس حلقہ میں جہاں ہم لوگ رہتے تھے اور جو اب کافی حد تک ٹوٹ چکا ہے، وہاں پر دلی کے بجے پور یا دس کے پچھواڑے رہنے والا ایک خاندان بسا ہوا ہے۔ انہوں نے دلی کی خیریت پوچھی اور دیر تک دلی ہی کی باتیں کرتے رہے۔ لاہور کے لاجپت رائے بھون میں تقسیم کے بعد بسنے والے خاندان جالندھر، دلی، گورداسپور اور لدھیانہ سے وہاں آ کر بسے ہیں۔ وہ ابھی تک اپنے ان شہروں کو ٹھیک اسی طرح سے نہیں بھول پائے ہیں جس طرح تقسیم کے شکار دوسرے ڈیڑھ کروڑ مہاجر اپنے اپنے گھروں کو نہیں بھلا پائے ہیں۔

لیکن واگہ کے اس پار بھی مار کاٹ اور فسادوں کا ویسا ہی سلسلہ جاری تھا۔ وہاں سے امرتسر جاتے ہوئے راستے میں اسی طرح انسانوں کو حیوان بنتے دیکھا۔ اسی طرح بے بس عورتوں کے پیچھے شیطانوں کو بھاگتے دیکھا۔ اسی طرح کی چیخیں

سسکیں۔ اسی طرح خوفزدہ آنکھیں دیکھیں۔ آگ کی لپٹیں یہاں بھی اٹھ رہی تھیں۔

دونوں طرف سے مہاجروں کے قافلے آجا رہے تھے۔ ہمارے سامنے جاتا ہوا قافلہ کچھ گھنٹے میں لاہور پہنچنے والا تھا۔ لیکن دونوں قافلوں میں کوئی بھی فرق نہ دکھائی دیتا تھا۔ دونوں ہی طرف بے بس انسان تھے جو پھٹی پھٹی ویران آنکھیں لیے اپنے گھر کو چھوڑ کر ایسے پردیس جانے پر مجبور ہوئے تھے جیسے ان کا دیس کہا گیا تھا۔

اسی طرح کی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہوا ہمارا قافلہ شام سے کچھ پہلے پٹھان کوٹ پہنچا۔ راستے میں جگہ جگہ لوگ قافلے سے الگ ہوتے گئے۔ یہ سبھی لوگ اپنے مستقبل کی تلاش میں تھے۔ وہ رات ہم نے بابوجی کے ایک دوست کے گھر گزاری۔ ان لوگوں نے ہمیں بہت پیار کیا۔ رات بھر ہم نے پٹھان کوٹ میں آگ کی لپٹوں کو اٹھتے دیکھا، چیخ پکار ہوتی رہی۔ صبح ہم نے دھرم شالہ کے لیے بس لی۔ بس اسٹینڈ سے شری امرناتھ سود کی کوٹھی جاتے ہوئے ہم نے سارے کوتوالی بازار کو بہت خراب حالت میں پایا۔ کچھ دکانیں جلی ہوئی تھیں کچھ لٹی ہوئی تھیں۔ جلا ہوا اور بکھرا ہوا سامان انسان کے وحشی پن کی داستان سنا رہا تھا۔ دکان کے ساتھ ہی پچھواڑے

میں دکاندار کا گھر ہوگا۔ لوٹے گئے اس کے مکان کے دوسرے سامان کے ساتھ ہی بچوں کی کتابیں، کاپیاں اور کھلونے بھی بکھرے پڑے تھے۔ ایک کاپی پر ایک بچے نے اپنے اسکول کا ہوم ورک کیا ہوا تھا۔ لکھا تھا: "کانگڑہ پنجاب کا پہاڑی ضلع ہے۔ دھرم شالہ کانگڑہ کا شہر ہے۔ میں اپنے دھرم شالہ کو بہت پیار کرتا ہوں۔ مجھے اپنا گھر بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے پاس بہت سے کھلونے ہیں۔ میں انھیں سنبھال کر رکھتا ہوں۔ ماں کہتی ہے اگر کھلونے اور کتابوں کو سنبھال کر نہ رکھا جائے تو وہ ہم سے روٹھ جاتے ہیں۔"

میں نے دیکھا آس پاس بہت سے کھلونے بکھرے اور کچلے پڑے تھے۔ نہ جانے اس بچے نے انھیں کس ارمان اور شوق سے اپنی الماری میں ٹھیک اسی طرح سے سنبھال کر اور سجا کر رکھا ہوگا جیسے کہ سنتوش اور میں نے لاجپت رائے بھون کے اپنے گھر میں اپنے کھلونوں کو رکھا تھا۔ نہ جانے آج وہ بچہ کس شرنارتھی کیمپ میں بیٹھا اپنے کھلونوں کی یاد میں آنسو بہا رہا ہوگا۔

دھرم شالہ میں ہم اپنے بابوجی کے دوست شری امرناتھ سود کے گھر پانچ مہینے رہے۔ اس خاندان نے ہمیں جتنا پیار دیا، اسے ہم زندگی بھر نہیں بھلا سکیں گے۔

کچھ مہینے بعد ہماری بی بی جی بھی دھرم شالہ آگئیں۔ وہ جب تک نہیں آئی تھیں ہم ان کے بارے میں پریشان رہے کیونکہ پنجاب میں فسادوں اور مارکاٹ کا سلسلہ کافی دنوں تک چلتا رہا۔ ڈیڑھ کروڑ افراد کو شرنارتھی بننا پڑا تھا۔

ہندوستان کی تقسیم دنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی ٹریجڈی مانی جائے گی۔ آج تک کہیں بھی اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو بے گھر نہیں ہونا پڑا تھا۔ جگہ جگہ شرنارتھی کیمپ بن گئے تھے۔ اس وقت تو یہ اندازہ لگانا اور تصور کرنا بھی ناممکن تھا کہ تھوڑے وقت میں یہ شرنارتھی اپنی بڑی محنت سے خود کو پھر سے خوشحال بنالیں گے۔ ان شرنارتھیوں نے جتنی مشکلات اور مصیبتوں کا سامنا کیا۔ اس سے انہیں محنت کرنے کی قوت اور حوصلہ ملا۔ بدقسمتی سے ان شرنارتھیوں کی ٹریجڈی کے بارے میں زیادہ نہیں لکھا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے لیئے بہت بڑی اور دکھ درد سے بھری ہوئی قیمت ہم لوگوں نے چکائی تھی۔

بعد میں ہم لوگ امرتسر آکر رہے۔ وہاں سے شملہ گئے اور پھر جالندھر آکر بس گئے۔ لاہور سے جالندھر مشکل سے ۸۵ میل ہوگا۔ لیکن یہ دکھوں، آنسوؤں اور سسکیوں کا بہت لمبا سفر تھا۔

اُن دنوں پنجاب میں اس طرح سسکیوں اور آہوں کا ماحول تھا کہ چاروں طرف سے

امرتیا پریتم کی مشہور نظم کی گونج سنائی دیتی تھی:

اج آ کھاں وارث شاہ نوں
کتھوں قبراں وچوں بول تے اج
کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقا کھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہین

لیکن کچھ ہی دنوں میں پنجاب کی بیٹیوں نے کراہنا بند کر دیا، اُن کے آنسو تھم گئے۔ انھوں نے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کے ساتھ مل کر راوی اور ستلج دریاؤں میں بھرے نفرت کے زہریلے پانی کو باہر نکال پھینکا۔ نئی لہلہاتی فصل اُگ آئی۔ پنجاب پھر سے پریم کے گیت گنگنانے لگا۔ پھر سے پنجاب میں بھنگڑے اور گِدّے کی لے تیز ہونے لگی۔ اُجڑے ہوئے پنجاب کے کھیت پھر سے ہرے بھرے ہو گئے اور وہ ہندوستان کا اناج کا گودام کہلانے لگا۔

پنجابیوں میں ہاتھوں کی محنت کا کچھ ایسا جادو ہے کہ جہاں جہاں انھوں نے ہاتھ لگایا، بنجر دھرتی سونا اگلنے لگی۔ کوئی بھی پنجاب جاتا ہی کہتا کہ یہ تو مغربی یورپ نظر آتا ہے۔ اس چھوٹی سی ریاست میں جتنے ٹریکٹر ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

پنجابیوں کی جفاکشی غیر ممالک میں بھی رنگ لائی۔ پنجابی جہاں بھی پہنچے، ریگستان، سبزہ زاروں میں بدلنے لگے۔ اُن کے ہاتھوں میں محنت کا جادو ہے۔ پنجابیوں کے بارے میں مذاقاً کہا جاتا ہے کہ اگر چاند پر بستیاں بسانے اور وہاں کھیتی باڑی کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو پنجابیوں ہی کا نام وہاں بسنے والوں کی فہرست میں ہوگا۔

لیکن چاند ستاروں کو اپنی بستیاں بنانے کا منصوبہ بنانے والے پنجابی نہ جانے اپنے

پنجاب کی سرحدوں کو محدود کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ وہ پنجاب، جو کبھی دہلی کے قریب سونی پت سے شروع ہو کر پشاور تک جاتا تھا، اب پنجابی صوبہ بن کر اتنا چھوٹا رہ گیا ہے کہ چند ہی گھنٹوں میں سارا پنجاب پار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم پنجابی اپنے پنجاب کو مزید اتنا چھوٹا اور تنگ کرنے پر تُلے ہیں کہ وہ 'دیس پنجاب' نہیں، بلکہ 'گلی پنجابیاں' بن کر رہ جائے گی۔

تنگ نظری کی یہ بری نظر اس طرح پنجاب کو لگی کہ پچھلے چند برسوں میں پنجابی اپنے بھانگڑے کی لے بھول کر تشدد اور نفرت کے بول دہرانے لگے۔ پنجاب کے دریاؤں میں ہمارے دشمنوں نے نفرت کا زہر گھول دیا اور وہ زہریلا پانی ہمارے پنجاب کی خوشحالی کو ڈسنے لگا۔ نفرت اور آنسوؤں سے بھری فصل اگنے لگی۔ ہم پنجابیوں کی عقل پر نہ جانے دشمنوں نے کون سے بھاری پتھر رکھ دیے کہ ہم اپنے ہی پینے کے پانی میں اپنے ہی ہاتھوں سے زہر گھولنے پر اتر آئے۔ یہ زہر ہمیں اندھے پن کا شکار بنا رہا ہے۔ ہمارے چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی ہے۔ اس سیاہ تاریکی میں اپنے، بیگانے نظر آ رہے ہیں اور اپنے ماں جائے بھائی اپنے ہی دشمن۔

آج سے اڑتیس برس پہلے، یعنی ۱۹۴۷ء میں شرنارتھی قافلے میں قدم قدم پر چیخوں اور آنسوؤں کا لمبا سفر طے کر کے مجھ جیسے لاکھوں بچے اپنے گھروں کو چھوڑ کر آزاد ہندوستان میں آئے تھے۔ میں اس قافلے کا درد بھرا سفر آج تک نہیں بھول پائی ہوں۔ ان قافلوں کے پھر سے چلنے کے تصور سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

میرے والد پرنسپل تحصیل داس آج ۸۰ برس کے ہو چکے ہیں۔ وہ جالندھر میں میرے بھائی اشوک کے ساتھ رہتے ہیں۔ کیا وہ دوبارہ شرنارتھی نہیں بن گئے؟ ۱۹۴۷ء میں وہ اپنا پنجاب، اپنا لاہور چھوڑنے پر مجبور کیے گئے تھے۔ کیا اب انہیں پھر سے اپنا پنجاب چھوڑنا پڑے گا؟ ان جیسے لاکھوں پنجابیوں کو بے گھر ہونے کا عذاب کب تک جھیلنا پڑے گا؟

منورما دیوان کا اردو، ہندی اور انگریزی کی صحافت میں ایک خاص مقام ہے۔ وہ ۱۹۷۱ء سے ہندستان کی واحد کثیر الزبان خبر رساں اور فیچر ایجنسی پریس ایشیا انٹرنیشنل کی ایڈیٹر ہیں جس کے ذریعے اُن کے مضامین ملک بھر کے اردو، ہندی، انگریزی، پنجابی، مراٹھی اور عربی زبانوں کے اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔
وہ ہندستان اور جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے لیے عراق نیوز ایجنسی کی چیف نامہ نگار بھی ہیں۔

پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد سے انھوں نے اپنی سرگرم اور فعّال صحافی زندگی میں یورپ، مغربی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا کا کئی بار دورہ کیا ہے۔

پنجاب کے مشہور انقلابی لیڈر دِں سورگیہ شریمتی سیتا دیوی اور پرنسپل چھبیل داس کی بیٹی ہیں۔ ان کے شوہر دیوان بیریندر ناتھ (ظفر پیامی) کا شمار ہندستان کے ممتاز صحافیوں میں ہوتا ہے۔

پریس ایشیا پبلیکیشنز
نئی دہلی